دیہی صنعتیں

اور

دیہات کی نئی تعمیر

از

جے۔ سی۔ کمارپّا

مکتبہ جامعہ دہلی

سنہ ۳۶ء

قیمت ۸ر

دیہی صنعتیں اور دیہات کی نئی تعمیر

۱۔ ہندوستانی زندگی میں گاؤں کی اہمیت

ہندوستان کی ترقی کے جو آثار آج کل نظر آرہے ہیں۔ اُن میں سب سے زیادہ امید افضا یہ چیز ہے کہ لوگوں نے اب دیہاتی زندگی کے متعلق غور و فکر کرنا شروع کر دیا ہے۔ مغربی اثر میں آنے کے بعد ہم نے یہ بات بھلا دی تھی کہ ہندوستان ایک دیہی ملک ہے۔ شہروں میں ہم نے مغربی انداز کی تعلیم حاصل کی اور یہ سوچا کہ اپنے ملک کو جدید ملکوں کے دوش بدوش لانے کے لئے جو طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ مغرب کی تقلید میں شہری حالات کو تمام ملک میں پیدا کیا اور پھیلایا جائے۔ لیکن اب خیالات میں تبدیلی ہو رہی ہے اور ہم اس نتیجہ پر پہنچ گئے ہیں کہ ہماری نجات من حیث القوم دیہی اصلاح کے ذریعے ہی ممکن ہے۔

کانگریس اور رائے عامہ کیوں اب دیہی اصلاح کی طرف متوجہ ہو رہی ہے اس کا [illegible] دریافت کرنا مشکل نہیں ہے۔ یہ بات اب ہر خاص و عام کی زبان پر ہے کہ ہندوستان ایک دیہاتی ملک ہے یہاں کی نوے فیصدی آبادی دیہاتی ہے اور ۳۰ فیصدی سے زیادہ اشیا رخام پیدا کرتی ہے۔ اس لئے جس کسی جماعت کے پیش نظر ملک کی مادی اور اخلاقی فلاح و بہبود ہے اُسے مجبوراً دیہات کی طرف متوجہ ہونا پڑے گا اصل ہندوستان صرف گاؤں ہی میں نظر آسکتا ہے۔ یہ بجائے خود معقول دلیل ہے۔ پھر اس کے علاوہ ایک اور بہتر دلیل بھی موجود ہے۔ ہماری تہذیب اور مغربی تہذیب میں بڑا فرق یہ ہے کہ ہماری تہذیب کی جڑ دیہاتی زندگی میں پیوست ہے اور مغربی تہذیب نے شہروں کی گود میں ہوش سنبھالا ہے اور وہیں پل کر جوان ہوئی ہے۔ قدیم یونان کے جمہوری دور میں شہروں کا ہی راگ گایا جاتا تھا۔ یورپ کے عہد متوسط میں طرز زندگی

کا تعین ایسے شاہی درباروں میں ہوتا تھا جو شہر میں واقع تھے۔ درباری زندگی کی خصوصیات آہستہ آہستہ جاگیرداروں تک پہنچتی تھیں جاگیرداروں سے زمینداروں تک اور زمینداروں سے کاشتکاروں تک۔ اسی طرح آج بھی یہ بات محتاج وضاحت نہیں ہے کہ مغربی تہذیب فی الحقیقت شہری تہذیب ہی۔ جس کی وجہ سے لوگ کثیر تعداد میں صنعتی مرکزوں میں جمع ہو جاتے ہیں۔ ان شہروں میں بڑے پیمانے پر دولت پیدا کی جاتی ہے اور لوگ ایک یکساں سانچے میں ڈھال دئے جاتے ہیں۔ ہندوستان میں ایسا کبھی نہیں ہوا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہمارے یہاں ایسے شہنشاہ تھے جو شہروں میں شان و شوکت سے رہتے تھے لیکن پھر بھی دیہات کی آزادی کبھی ختم نہیں ہوئی شہنشاہ صرف حملہ کے وقت لوگوں کی مدافعت کرتا تھا اور صنعت و حرفت اور تمدن و تہذیب کا مربی اور سرپرست ہوتا تھا۔ دیہی زندگی کے نصب العین اور زندگی کی سادگی کی عزت ہر شخص کے دل میں موجود تھی اور کھیتی کو مقدس سمجھا جاتا تھا۔ ہمارے تمدن کو اسی وقت بہترین طریقے پر سمجھا جا سکتا ہے جب اس زرعی ماحول کو سمجھ لیا جائے۔ جس میں کہ وہ پیدا ہوا ہے۔ بنا بریں مغرب کی (جس کی ترقی کے اسباب ہم سے بنیادی طور پر مختلف ہیں) محض تقلید کرنا ہمارے قومی ترک کے لئے ہرگز موزوں اور مناسب نہیں ہے۔

پس اگر گاؤں کو ہمارے خیالات میں ایک مرکزی حیثیت حاصل کرنی ہی ہے تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اُن اصولوں کو دریافت کیا جائے جن پر ہماری دیہاتی زندگی کی فی الواقعی بنیاد قائم کی گئی تھی کیونکہ نئی عمارت کے دوبارہ بنانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم موجودہ بنیادوں پر اپنی تعمیر شروع کریں۔ خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ ان بنیادوں کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے زمانہ کی ہزاروں تباہ کاریوں کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کیا ہے۔ اس لئے ہمارے لئے یہ لازمی ہے کہ ابتدائی معماروں کے نقشوں کا مطالعہ کریں کیونکہ اگر ہم اُن کی تصریحات کی پوری پیروی نہ کریں گے تو ہماری عمارت بیٹھ جائے گی۔ یا استعارہ بدل کر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر نئے اعضاء کو پرانے جسم پر محض تھوپنا منظور نہیں ہے، تو یہ ضروری ہے کہ ان میں اور پرانے جسم میں عضوی اتحاد پیدا

کیا جائے۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ پرانے اعضا کو ہی دوبارہ جسم سے جوڑ دیا جائے کیونکہ کوئی زندہ جسم اپنی زندگی کے مختلف مدارج میں بالکل یکساں نہیں رہ سکتا۔ یہ بدلتا رہتا ہے جب حالات مختلف ہو جاتے ہیں تو ان سے مطابقت کی کوشش کرتا ہے اور یونہی اس کی نشوونما ہوتی ہے۔ گاؤں کو ترقی دینے کی کوشش میں ہم اپنی کاہلی اور سہل انگاری سے ماضی کی طرف واپس نہیں جا سکتے اور نہ اس کی غلامانہ تقلید کر سکتے ہیں۔ ہماری جڑیں بے شک ماضی میں پیوست ہوں گی اور یوں ہمارے خیالوں اور کاموں کا اصل اصول وہی ہوگا جو ماضی کی دیہاتی تنظیم میں پایا جاتا تھا۔ لیکن اس کا اظہار ان مختلف حالات کی بنا پر جو اس وقت پائے جاتے ہیں مختلف ہوگا کیونکہ زندگی ورثہ اور ماحول دونوں سے مل کر بنتی ہے۔

بنابریں اپنی قومی زندگی کو از سر نو بنانے کی کوشش کرتے وقت یہ لازم ہو جاتا ہے کہ ہم ان بنیادی خیالوں کا صحیح اندازہ کریں جن پر ہماری دیہاتی زندگی اور تنظیم قائم ہے یہ خیالات جہاں تک سمجھ میں آتے ہیں حسب ذیل ہیں۔

۱۔ جماعت کے ہر رکن کے لئے کم سے کم ناگزیر اسباب حیات یقینی طور پر فراہم کرنا۔

اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے کام کرنے والوں کو معاوضہ جنس کی شکل میں دیا جاتا تھا۔ اور اس طرح ان کی ضرورت کی تمام اشیاء انھیں غذا کی شکل میں مل جاتی تھی۔ یہ بات ظاہر ہے کہ ایسے نظام میں کوئی شخص بھوکا نہیں رہ سکتا۔ مشترکہ خاندان ایک دوسرا طریقہ تھا جو اسی مقصد کے حاصل کرنے کے لئے اختیار کیا گیا تھا۔ اور اس سے دولت کی تقسیم میں بھی بہت زیادہ عدم مساوات پیدا نہ ہو سکتی تھی۔

۲۔ مقابلہ اور جلب منفعت کی مطلق العنان خواہش کو قابو مین رکھنا اور اس کی جگہ امداد باہمی کو ترقی دینا۔

ذات پات کے نظام کے ذریعے سے جماعت کا کام اس کے مختلف ارکان میں تقسیم ہو جاتا تھا اور انھیں اپنا اپنا کام کرنا ہوتا تھا اس سے اس بات کی حفاظت ہو جاتی تھی کہ اگر کسی خاص

تجارت میں نفع زیادہ ہوتا تھا تو ہر شخص دوسروں سے مقابلہ کرنے کے لئے اُسی طرف نہیں لپکتا تھا اور اس کوشش میں جماعتی توازن کو آج کل کی طرح نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ مثلاً جب قانون کے پیشے میں آمدنی زیادہ ہوتی ہے تو ہر شخص وکیل بننے کی کوشش کرتا ہے اور اس بات کا خیال ترک کر دیتا ہے کہ جماعت کو کتنے وکیلوں کی ضرورت ہے۔ ذات کے نظام سے جماعتی وفاداری اور امداد باہمی بھی پیدا ہوتی تھی جس کی کمی اُن لوگوں میں جنھوں نے شہر میں تربیت پائی ہے بہت نمایاں ہے۔

۳۔ گاؤں کی زندگی کو اپنی جگہ مکمل بنانا تاکہ ہر گاؤں اپنی ضروریات کے مطابق کافی مقدار میں اشیاء پیدا کر سکے اور اپنی ابتدائی ضروریات کے لئے باہر کا محتاج نہ رہے۔

اس کا نتیجہ یہ تھا کہ مختلف تجارتوں اور پیشوں کے کاموں میں ہم آہنگی پیدا ہو جاتی تھی اور لوگ خارجی حکومتوں کے ناجائز انتفاع اور ان پر انحصار کرنے سے محفوظ ہو جاتے تھے۔ طرز حکومت کے اعتبار سے بھی گاؤں اپنی جگہ پر مکمل ہوتا تھا۔ اس کے معاملات کا فیصلہ پنچایت کرتی تھی۔ اسی طرح ہر گاؤں ایک جمہوریت ہوتی تھی جس کی صدارت کا کام پنچایت کے سپرد ہوتا تھا۔ جو اس بات کا خیال رکھتی تھی کہ دیہاتی زندگی کے تمام شعبے مناسب طور پر کام کریں۔

۴۔ روحانی باتوں کا مرتبہ ارفع و بلند تھا۔

یہ اسی بات سے ظاہر ہے کہ ہندوستان کی اعلیٰ ترین ذات راجہ یا تاجر کی نہیں ہے بلکہ پروہت اور پنڈت کی ہے۔ راجہ چاہے کتنا ہی امیر اور طاقتور کیوں نہ ہو وہ ایک آوارہ گرد مفلس مہاتما کی عزت کرتا تھا۔ اسی سلسلہ میں یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ محض دولت کمانے کی بہت زیادہ قدر نہیں تھی۔ بلکہ اس کے برعکس ترک دنیا کو انسانی ترقی کی بلند ترین منزل سمجھا جاتا تھا۔

ان نصب العینوں کے مقابلے میں مغربی تہذیب کی بنیاد جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے دنیاداری زندگی تھی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ زندگی کی سادگی کی جگہ مقبوضات کی کثرت کی تعریف و توصیف کی جاتی ہے جس آدمی کے پاس دولت ہے اُس کی عزت کی جاتی ہے اور اُسے بادشاہ کی طرف سے طبقہ امراء میں جگہ مل جاتی ہے۔ علاوہ ازیں مغرب میں معاشی تنظیم کی بنیاد سخت اور بے درد مقابلے

پر رکھی گئی ہے جس کی وجہ سے کمزور پست و ذلیل ہو جاتے ہیں اور طاقت ور کمزوروں سے ناجائز فائدہ اٹھا کر اور زیادہ طاقتور بن جاتے ہیں پھر معاشی ترقی کی کوئی پہلے سے سوچی ہوئی اسکیم یا منصوبہ نہیں ہے جس کی وجہ سے پیداوار میں اضافہ طلب کا لحاظ کئے بغیر ہوتا رہتا ہے۔ تقسیم کو رسد سے کوئی مناسبت نہیں ہوتی اور تمام معاشی نظام میں ایک بے ترتیبی نظر آتی ہے۔ حرص و طمع کی عملداری ہے۔ منڈیوں اور اشیاء خام حاصل کرنے کے لئے دوسرے کا گلا گھونٹ کر اپنے لئے راستہ صاف کیا جاتا ہے اور تمام اخلاقی اور انسانی خیالات کو پس پشت ڈال دیا جاتا ہے۔ مغربی اقوام جس مصیبت سے اس وقت دوچار ہیں اُس سے ہمیں عبرت حاصل کرنی چاہئے، اور اُن کی اندھا دھند تقلید نہ کرنی چاہئے۔ لیکن ہمارے معاشی مسائل کے حل کرنے میں مغرب جو حصہ لے سکتا ہے اس کو لائق اعتنا نہ سمجھئے اور اپنی دینی تنظیم کے بنیادی خیالات کے مطابق تعمیر جدید کے کام کی ابتدا کرنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ہم مختصر طور پر اُن معاشی نظاموں کی تحقیقات کریں جو اس وقت دنیا میں برسر اقتدار نظر آتے ہیں تاکہ ہم بذات خود اس بات کا فیصلہ کر سکیں کہ اپنے گھر کی حالت درست کرنے کے واسطے ہمارے لئے کونسا طریقہ اختیار کرنا سب سے زیادہ موزوں ہوگا۔

687

۲۔ دُنیا کے آج کل کے معاشی نظام

اس وقت معاشی زندگی کی جو دو اہم ترین شکلیں پائی جاتی ہیں۔ وہ سرمایہ داری اور اشتراکیت ہیں۔ سرمایہ داری نظام یورپ میں جاگیردارانہ نظام کے جانشین کی حیثیت سے نمودار ہوا۔ جاگیرداری نظام میں اقتدار جاگیرداروں کو حاصل تھا وہ مضبوط قلعوں میں رہتے تھے اور اپنی دولت اور قوت میں اضافہ کرنے کے لئے وقتاً فوقتاً قرب و جوار کے چھوٹے چھوٹے گاؤں پر حملہ کرتے رہتے تھے کم حیثیت کاشتکار اور مزدور انھیں خراج ادا کرتے تھے اور اس کے بدلے میں اُن کے حملے سے محفوظ رہتے تھے۔ جاگیرداروں کی ذہنیت سوائے خود غرضانہ نفع طلبی کے اور کچھ نہ تھی جب مشین کے استعمال کی وجہ سے یورپ میں صنعتی انقلاب ہوا اور اس

وقت ہندوستان سے بڑے بڑے خزانے کھینچ کر یورپ چلے گئے۔ اُن جاگیرداروں کی جگہ بڑے بڑے ساہوکار پیدا ہو گئے۔ جنھوں نے اپنے طور پر ایک ایسا نظام قائم کر لیا جو جاگیرداروں کے نظام سے بہت سی باتوں میں مشابہ تھا۔ اور یوں یہ ساہوکار بھی اسی طرح منافع کمانے لگے جیسے جاگیردار خراج کے ذریعے سے کماتے تھے۔ یہاں بھی ذہنیت خود غرضانہ نفع طلبی کی تھی اور طریقہ یہ تھا کہ مشین کے ذریعے سے جتنا ہو سکے نفع حاصل کیا جائے اور اخلاقی پابندیوں کی کوئی پروا نہ کی جائے۔ ایک واحد آدمی مشین کے ذریعے سے ہزاروں مزدوروں کی محنت کا نفع حاصل کرنے لگا۔ وہ اپنی جیبیں بھرتا رہا اور چونکہ مشین کا مالک وہی ہوتا تھا اُس کے مزدور بے بس ہوتے تھے۔ اور اُنھیں اُس کی حرص و آز کو بلا احتجاج کیے برداشت کرنا پڑتا تھا۔ سرمایہ داری نظام کی ایک سب سے بڑی خرابی ہے کہ یہ نہ صرف نفع طلبی کی ذہنیت اور اُس کی معرفت بدترین حرص اور خود غرضی کو ترقی دیتا ہے بلکہ مزدور سے دولت پیدا کرنے کے اوزار چھین کر اُس کی آزادی بھی چھین لیتا ہے۔ جب یہ ہو جاتا ہے تو سرمایہ کی فتح اور مزدور کی غلامی مکمل ہو جاتی ہے۔ اپنے قرب و جوار کے آدمیوں سے جو ناجائز فائدہ حاصل ہوتا ہے سرمایہ دار اسی پر قناعت نہیں کرتا بلکہ سرمایہ دار اپنی حریص نگاہوں کو دنیا کے بعید ترین گوشوں تک لے جاتا ہے۔ کیونکہ اُسے اپنی مصنوعات کے لئے منڈیوں اور اپنے کارخانوں کے لئے خام اشیاء کی ضرورت ہوتی ہے، چنانچہ بڑی بڑی رقموں کے ساہوکارے سے وہ ان جگہوں پر قبضہ کرتا ہے اور اس بات کا پورا انتظام کرتا ہے کہ یہاں کے رہنے والوں کی حیثیت لکڑہاروں اور پنہاروں جیسے ہو جائے۔ وہ اُنھیں اپنے ملک میں صنعتی اشیاء پیدا کرنے سے باز رکھتا ہے کیونکہ ایسی حالت میں اُس کی منڈی اُس کے ہاتھ سے نکل جاتی ہے۔ غرض کہ اس طرح نظام سرمایہ داری سے نظام شہنشاہیت پیدا ہوتا ہے۔ اور کمزور قوموں کو غلام کر کے اُن سے ناجائز فائدہ حاصل کیا جاتا ہے۔ اس کاروبار میں یہ ظاہر ہے کہ اخلاقی پابندیوں کا کوئی لحاظ نہیں رکھا جاتا کیونکہ تجارت بہرحال تجارت ہے اور اُس میں جو چیز قابل لحاظ ہوتی ہے وہ صرف نفع ہوتا ہے۔ بنا بریں

کوئی چیز ساہوکار کو اپنے گندے کام کرنے سے باز نہیں رکھ سکتی۔ اگر کچھ روک ٹوک کی جاتی ہے۔ تو فوراً جنگ شروع ہو جاتی ہے اور ناقابل بیان کشت و خون اور تباہی پھیل جاتی ہے سرمایہ دار کو اپنا سونا چاہیئے، چاہے اُس کی وجہ سے خون کی کتنی ہی ندیاں کیوں نہ بہہ جائیں۔ غریب مزدور کو جس نے مشین کا ایک حقیر پرزا بننے کے لئے پہلے اپنی آزادی کو قربان کیا تھا۔ اب اعلیٰ نصب العینوں کا نشہ دیا جاتا ہے اور اُسے قومی عزت کا محافظ اور وحشیوں کو مہذب بنانے والا کہہ کر اُبھارا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ خوشی خوشی توپ کی غذا بن کر سرمایہ داروں کے حرص و آز کا شکار ہو جاتا ہے۔ سرمایہ داری کی جو تصویر اوپر کھینچی گئی ہے وہ بہت بھیانک نظر آتی ہے لیکن اگر سرمایہ داری سے اُس کا اوپری خول اوتار دیا جائے اور اُس کی بدنما عریانی کا مشاہدہ کیا جائے تو اس کے علاوہ اور نظر ہی کیا آ سکتا ہے؟ سرمایہ داری کی جلو میں خود غرضی، ناجائز انتفاع، جنگ، تباہی اور خون ریزی کا آنا ناگزیر ہے۔

اشتراکیت ان بُرائیوں کے خلاف ایک کھلے ہوئے احتجاج کی شکل میں رونما ہوئی اس لئے قدرتی طور پر اس سے یہ توقع وابستہ کی جاتی ہے کہ یہ ہمارے سامنے نظام سرمایہ داری کا ایک ایسا نعم البدل پیش کرے گی جو ہماری قوم کے لئے نہایت ہی موزوں ہوگا۔ اشتراکیت نے اس بات کو سمجھ لیا کہ بیان کرتے کا چاہے جو طریقہ اختیار کیا جائے سرمایہ داری کی جڑ دراصل نفع طلبی اور خود غرضی ہے اور اُس نے اس سے نجات حاصل کرنے کا طریقہ یہ بتایا کہ پیدائش دولت کو ایک اجتماعی شکل دے دی جائے جو چیز بھی پیدا کی جائے اگر اُس کی ملکیت جماعت کو حاصل ہو تو خود غرضی اور حرص کی جڑ ہی کٹ جاتی ہے۔ اشتراکیت نے نفع طلبی کی ذہنیت کو جڑ سے اکھاڑ کر یہ سمجھا کہ اُس نے تمام اُن برائیوں پر فتح پالی ہے جو سرمایہ داری میں پائی جاتی ہیں لیکن اس کا نتیجہ درحقیقت یہ ہوا کہ اگر سرمایہ داری ایک انتہا پر تھی تو اشتراکیت دوسری انتہا پر پہنچ گئی سرمایہ داری میں ہر فرد کو آزادی تھی استطاعت ہونے کی حالت میں ہر شخص کے لئے یہ ممکن تھا کہ ہر موقع سے پوری طرح فائدہ اٹھا سکے۔ خواہ اُس سے دوسروں کو کتنا ہی نقصان

کیوں نہ ہوتا ہو لیکن دوسروں کے نقصان کا انسداد کرنے کی کوشش میں اشتراکیت دوسری انتہا تک پہنچ گئی اور اُس نے سرے سے افراد کی ذاتی جدوجہد اور مساعی ہی کو یک قلم ختم کر دیا۔ جماعت سب کچھ ہو گئی اور فرد کو اس قدر دبایا گیا کہ وہ نظام سرمایہ داری کی طرح دوبارہ ایک بڑے پہیئے کا حقیر پرزہ بن گیا۔ چند اشخاص تمام قوم کے لئے منصوبے بناتے ہیں اور بقیہ تمام لوگوں کے لئے اُن کے احکام بجا لانے کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں ہے۔ اشتراکیت پسند لوگ اس میں شک نہیں اس کی نہایت پرزور تردید کریں گے کیونکہ اُن کا دعویٰ یہ ہے کہ نظام اشتراکیت میں صرف چند آدمی جماعت کے کاموں کو نہیں چلاتے بلکہ مزدوروں کی جماعت کے لکھوکھا آدمی جلسہ مشاورت میں شریک ہوتے ہیں اور جو بات اُنھیں مطلوب ہوتی ہے اُس کی بابت فیصلہ کرتے ہیں لیکن اس کی تردید میں یہ کہا جا سکتا ہے اول تو لکھوکھا آدمی جب کوئی فیصلہ کرتے ہیں اُس کی حیثیت اس سے زیادہ نہیں ہوتی کہ چند با اقتدار آدمی جو چاہتے ہیں اُس کی موافقت میں محض رسمی طور پر رضامندی کا اظہار کر دیا جاتا ہے۔ پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ جہاں تک پیدائش دولت کا تعلق ہے اشتراکیت میں ذاتی جدوجہد، قوت تخلیق اور شخصیت کے اظہار کا موقع بالکل باقی نہیں رہا ہے۔ اور اُن چیزوں کی عدم موجودگی میں اشیا کی تعداد میں اشتراکیت کی وجہ سے جو اضافہ ہوتا ہے اُس کی پوری قدر و منزلت باقی نہیں رہتی۔ کیونکہ انسان جس چیز کو سب سے زیادہ عزیز رکھتا ہے وہ درحقیقت اُس کی انفرادیت ہے۔ یعنی اس بات کی آزادی کہ جس طرح چاہے سوچے اور عمل کرے اور تخلیقی کام انجام دے لیکن اگر ایک آدمی کو ایک مقررہ نمونے کے مطابق کام کرنا پڑے تو وہ انسانیت کے عظیم ترین ترکہ یعنی اپنی انفرادیت سے محروم ہو جاتا ہے۔ اور اس سے زیادہ سخت الزام کسی معاشری نظام کے خلاف کوئی دوسرا عائد نہیں کیا جا سکتا کیونکہ جماعت بہرحال افراد کا مجموعہ ہوتی ہے اور جب جماعتی نظام انفرادیت دبا ڈالے تو وہ اپنے مقصد کو پورا کرنے سے قاصر رہتا ہے۔

پھر اشتراکیت پسندوں کے پاس اس کا کوئی علاج بھی نہیں ہے کیونکہ نفع طلبی کی بے رو

ٹوک عملداری کے خلاف احتجاج کرنے میں تو وہ بلاشبہ حق بجانب تھے لیکن سرمایہ داری کے مرکزیت پسند طریقۂ پیداوار کو اپنی حالت پر برقرار رکھنے میں وہ ٹھیک نہیں تھے۔ کیونکہ سرمایہ داری کے مرکزیت پسند طریقہ پیداوار کا مفہوم اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ جو اشیاء پیدا کی جانے والی ہیں، اُن کے متعلق سوچنے اور منصوبہ بنانے کا کام مرکز کے چند با اقتدار آدمیوں کو سونپ دیا جائے اور باقی سب آدمی مشین کے بڑے پہیئے کے ایک حقیر جز بنا دئے جائیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کام کرنے والے اشتراکیت کے نظام میں بھی اسی خرابی کا شکار ہو گئے جس کے وہ نظام سرمایہ داری میں شکار تھے یعنی یہ کہ اُن کا کام سوچ سمجھ کر کام کرنا نہ رہا، بلکہ غیر مشروط اطاعت اور فرماں برداری ہو گیا۔ مرکز پر جو لوگ ہیں اُن کے حکم کے مطابق ایک ہی قسم کی اشیاء کثیر پیمانے پر پیدا کی جانے لگیں اور اکثر ایسا ہونے لگا کہ ایک آدمی کا کام صرف یہ رہ گیا کہ جب ڈبے تیزی سے یکے بعد دیگرے اس کے سامنے سے گزریں تو وہ اُن پر لیبل لگاتا رہے اس کام کی یکسانیت روح کو مردہ کرنے والی ہے۔ اور جس مشین کو انسان نے بنایا تھا اُس نے آخر کار خود انسان کو ہی مشین بنا کر چھوڑا۔ کیونکہ اُس مشین کی طرح جسے وہ چلاتا ہے وہ بھی صرف ایک حرکت کرنا جانتا ہے۔ اور صرف اس وقت کام کرتا ہے جب مرکزی دفتر میں بٹن دبایا جاتا ہے۔ اُپج، جدت، اظہار نفس سب مفقود ہو گئے ہیں۔ اور اگر کہیں باقی ہیں تو وہ اس نظام میں پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھے جاتے۔ لیکن کیا اظہار نفس کی خواہش ایک انسان کا سب سے قوی محرک عمل نہیں ہے؟ ایک بچہ کو غور سے دیکھو وہ اُسی وقت سب سے زیادہ خوش نظر آتا ہے جب اُسے سب سے زیادہ موقع اظہار نفس کا ملا ہوا ہوتا ہے اور افسردہ ہو جاتا ہے جب اُس پر کسی طرح کی پابندی عائد کی جاتی ہے اور اگر اُسے روکا جائے تو بہت خفا ہوتا ہے۔ آپ اس کی ننھی ننھی اینٹوں سے اسے ایک خوبصورت سا منارہ بنا دیں۔ وہ اسے دیکھ کر بہت خوش ہوگا لیکن فوراً ہی اسے گرا دے گا تاکہ دوبارہ وہ خود بنائے۔ چاہے اس کا بنایا ہوا منارہ کتنا ہی کمزور ہو اور آسانی سے گر جائے لیکن وہ اپنے اس ذاتی کارنامے کو دیکھ کر خوشی کے مارے پھولا نہیں سمائے گا۔ یہی حال سیاسیات میں ہے۔ آخر لوگ حکومت

خود اختیاری کا کیوں مطالبہ کرتے ہیں بعض صورتوں میں ممکن ہے کہ بدیشی حکومت نہایت معقول ہو لیکن انسان محض معقولیت ہی کا تو متمنی نہیں ہوتا۔ دراصل وہ تو اظہار نفس کا خواہشمند ہوتا ہے۔ اس لئے اس کا دعویٰ ہے کہ اچھی حکومت بھی حکومت خود اختیاری کی نعم البدل نہیں ہو سکتی۔ چاہے مزدوروں اور کسانوں کی عام حالت سرمایہ داری کے مقابلے میں اشتراکیت کے ماتحت کہیں بہتر ہو کیونکہ سرمایہ داری کی طرح اشتراکیت میں پیداوار انفرادی مفاد کے لئے نہیں ہوتی لیکن جب تک اشتراکیت میں پیداوار کی مرکزیت موجود ہے اس وقت تک تنوع کی گنجائش نہیں ہو سکتی اور نہ عوام کو اظہار نفس کا موقع مل سکتا ہے۔

۳۔ ہندوستانی مشکلات کا حل

عدم مرکزیت اور سودیشی

اگر دنیا کا موجودہ اقتصادی نظام مسئلہ تعمیر قوم کا کوئی حل پیش نہیں کرتا جس کی آج ہمیں ضرورت ہے تو ہمیں کوئی ایسی معقول تدبیر تلاش کرنا ہے جس کے ذریعہ سے ہم اپنی قومی عمارت کی تعمیر کر سکیں۔ سرمایہ داری میں یہ مشکل ہے کہ وہ ذاتی نفع حاصل کرنے کی پوری آزادی دیتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خود غرضی۔ حرص۔ تشدد اور ناجائز فائدہ اٹھانے کے جذبات کو فروغ ہوتا ہے۔ اشتراکیت نے اس کے تدارک کی کوشش کی لیکن اس کوشش میں وہ دوسری انتہا کو پہنچ گئی۔ یعنی اس نے ہر طرح کے ذاتی منافع کا انسداد کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انفرادی اظہار رائے کا باب قطعی مسدود ہو گیا۔

اس لئے ہمیں غور کرنا چاہئے کہ آخر ہماری نجات کس چیز میں ہے؟ ہم یہ نہیں طے کر سکتے کہ آیا ہمیں ذاتی نفع کا اصول ترک کر دینا چاہئے یا باقی رکھنا چاہئے۔ اس لئے ہم عجیب گومگو میں ہے۔ لیکن جیسا کہ منطق جاننے والے اچھی طرح جانتے ہیں کہ گومگو کی یہ حالت محض خیالی ہوتی ہے اور ہمیشہ ایک درمیانی راستہ نکالا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اس معاملے میں بھی ہماری نجات اسی درمیانی راستہ میں ہے اگر ہیگل کا یہ قول صحیح ہے

کہ حق نہ تو دعوے میں ہوتا ہے نہ اس کی تردید میں بلکہ ان دونوں کی امتزاجی ترکیب میں ہوتا ہے جس میں دونوں کے صحیح اجزا شامل ہوتے ہیں تو پھر ہم بھی اپنی مشکل کا حل معلوم کر سکتے ہیں خوش قسمتی سے ارادی طور پر یا غیر ارادی طور پر ہمارے آبا و اجداد بھی اسی پر عمل کرتے آئے ہیں اور یہی ہماری مشکلات کا حل ہے کہ نہ تو انفرادی نفع کا اصول اپنی جگہ پر غلط ہے اور نہ اجتماعی قبضہ و اختیار میں کوئی برائی ہے۔ البتہ اگر انفرادی نفع کا اصول اپنے حدود سے تجاوز کر جائے اور اس سے دوسروں کو نقصان پہنچنے لگے تو وہ برا ہے اسی طرح اگر اجتماعی قبضہ و اختیار کا اصول اپنے حدود سے گذر جائے اور افراد کی آزادی عمل سلب کرے تو وہ بھی برا ہے ایسی حالت میں ہمیں کوئی ایسی تدبیر نکالنی چاہیئے جس میں انفرادی نفع اور اجتماعی قبضہ و اختیار دونوں کی گنجائش ہو۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ صورت صرف اس طرح ممکن ہو سکتی ہے کہ پیداوار کی مرکزیت کو ختم کر دیا جائے اور سودیشی کے اصول کو رواج دیا جائے۔ عدم مرکزیت کا منشا یہ ہے کہ مرکز سے یہ ہدایت نہ دی جائے کہ کس قسم کی اشیا پیدا کی جائیں اور کس طرح بلکہ پیدا کرنے والے کے ذوق اور استعداد پر اس معاملے کو چھوڑ دیا جائے۔ صرف اسی صورت میں عوام کو ذاتی اظہار رائے اور ذاتی عروج کا موقع مل سکتا ہے۔ اس کے خلاف یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر ہر شخص کو اپنا من مانا کرنے کی اجازت دیدی جائے تو اس کا نتیجہ وہی سرمایہ داری ہوگی، کیونکہ ایک شخص کو اپنی حرص کی وجہ سے پیداوار پر قابض ہونے کا موقع ملے گا، یہ صحیح ہے لیکن بہر حال اس کا انسداد کرنا ہوگا اور یہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ بڑی مشینوں سے کام نہ لیا جائے اور زیادہ مقدار میں پیداوار نہ ہو۔ یعنی صرف وہی مشینیں استعمال کیجائیں جن میں صرف ایک شخص کام کر سکے مثلاً سینے کی مشین ۔

علاوہ ازیں ہمیں عوام میں سودیشی کی تبلیغ کرنا ہوگی تاکہ وہ اپنے قریب ترین لوگوں کی بنائی ہوئی چیزیں دور والوں کی تیار کردہ چیزوں کے مقابلے میں استعمال کرنا اپنا فرض سمجھیں ۔ بالفاظ دیگر ہمیں ہر گاؤں کو کافی بالذات بنانے کے قدیم نظریئے کو از سر نو جاری کرنا ہوگا۔ تاکہ

لوگوں کی خاص خاص ضرورتیں خود ان کے گاؤں میں پوری ہو سکیں اور بڑی حد تک باہر کے محتاج نہ رہیں۔ اگر ہر گاؤں اس طرح باہر سے مستغنی ہو جائے اور اپنی خاص خاص ضروریات خود پوری کرنے لگے تو ہر کاریگر صرف اتنی مقدار میں چیزیں تیار کرے گا جتنی اس کے گاؤں کو ضرورت ہو۔ یعنی پیداوار گاؤں کی مانگ کے مطابق محدود ہو جائے گی۔ اور جب یہ صورت ہوگی تو نہ زائد از ضرورت پیداوار کا سوال پیدا ہوگا۔ اور نہ نئے نئے بازار تلاش کرنے کی مشکل درپیش آئے گی۔ پھر کوئی تمام پیداوار پر قبضہ کرنے کی بھی کوشش نہ کرے گا کیونکہ جب سودیشی کے استعمال کی وجہ سے ہر گاؤں کو اپنے گاؤں کے باہر کی چیزوں کی ضرورت نہ رہیگی تو وہ اسے سعی لاحاصل سمجھے گا۔

یہاں پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سودیشی کا صحیح مفہوم واضح کر دیا جائے اور تمام امکانی غلط فہمیاں رفع کر دی جائیں کیونکہ سودیشی اور تنگ خیال جماعت بندی میں واقعی غلط فہمیاں پیدا ہونے کا امکان ہے۔ تنگ نظر جماعت بندی میں تو ایک شخص اپنی ہی جماعت۔ فرقہ۔ یا طبقہ کی چیزیں استعمال کرنے کی قسم کھاتا ہے اور دوسرے کی اس کے یہاں گنجائش ہی نہیں ہوتی۔ اسے کسی اصول سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ اور اگر اس پر عمل کیا جائے تو قومی اور بین الاقوامی اتحاد کے لئے منافی ثابت ہوتا ہے۔ فی زمانہ ریڈیو۔ ہوائی جہاز اور تار برقی وغیرہ نے لوگوں کو ایک دوسرے سے قریب تر کر دیا ہے۔ گویا فاصلے کے لحاظ سے دنیا سمٹ گئی ہے۔ ایسی حالت میں یہ انتہائی حماقت ہوگی کہ دنیا کو چھوٹے چھوٹے محدود حلقوں میں تقسیم کر دیا جائے جہاں ایک حلقہ کا دوسرے سے کوئی تعلق ہی باقی نہ رہے۔ حامیان سودیشی کا یہ نشا ہرگز نہیں ہے۔ ان کا نشا تو محض یہ ہے کہ ”خیرات پہلے گھر ہی سے شروع ہونا چاہیئے“ ہم پر سب سے پہلے ہمارے قریب ترین پڑوسی کا حق ہے۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ یہ حلقہ وسیع ہوتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ تمام بنی نوع انسان کو اپنی آغوش میں لے لیتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک خاندان کو لیجئے ہر شخص اپنے اہل و عیال اور اپنے افراد خاندان سے زیادہ متعلق اور منسلک ہوتا ہے اس لئے

دوسروں کے مقابلے میں اس کا یہ فرض ہے کہ وہ ان کے خورونوش کا انتظام کرے اور انھیں ننگا بھوکا نہ رہنے دے اپنے خاندان کے فرائض سے عہدہ برا ہونے میں گویا وہ سماج اور تمام بنی نوع انسان کے فرائض سے سبکدوش ہوتا ہے۔ یہ تمام دائرے ایک دوسرے سے جدا نہیں ہیں بلکہ ان سب کا مرکز ایک ہی ہے یعنی ایک کے اندر ایک واقع ہیں۔ چھوٹے اور بڑے دائرے میں کوئی مخالفت یا تضاد نہیں ہے اس لئے اگر ہم چھوٹے دائرے کی خدمت کریں تو گویا وہ بڑے دائرے کی بھی خدمت ہوگی۔ لہذا سودیشی کا یہ مفہوم ہوا کہ قریب ترین لوگوں کا پہلے حق ادا کیا جائے کیونکہ دوسروں کے مقابلے میں ان کا ہم پر زیادہ حق ہے۔ لیکن اس کا یہ منشا نہیں ہے کہ ہم ایک خاص طبقہ تک اپنے آپ کو محدود کرلیں اور باہر کے افراد کے حقوق بالکل نظر انداز کردیں۔ اس سلسلے میں یہ کہاوت کہ "خیرات گھر سے شروع ہونا چاہیئے" بالکل صادق آتی ہے۔ کیونکہ اس میں خیرات کے گھر سے شروع ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ یہ نہیں کہا ہے کہ خیرات گھر ہی میں ختم بھی ہوجانا چاہیئے۔ اسی طرح سودیشی تحریک کا بھی یہی منشا رہے کہ پہلے ہر شخص اپنے گاؤں کے حقوق سے عہدہ برا ہو پھر رفتہ رفتہ اپنے دائرۂ عمل کو تمام نوع انسانی تک پھیلا دے۔ یہ مسئلہ اتنا اہم ہے اور اس میں اتنی غلط فہمیاں پیدا ہونے کا امکان ہے کہ سودیشی تحریک کے بانی کے الفاظ بجنسہ نقل کردینا زیادہ مناسب ہوگا۔ وہ فرماتے ہیں کہ "سودیشی ہی ایک ایسا اصول ہے جو انسانیت اور محبت کے عین مطابق ہے۔ اگر میں اپنے خاندان ہی کا پوری طرح حق ادا نہیں کرسکتا تو سارے ہندوستان کی خدمت کا خیال عبث ہے۔ اس لئے یہ مناسب ہے کہ میں اپنی تمام سرگرمیوں کو اپنے خاندان کے لئے وقف کردوں اور یہ یقین رکھوں کہ اس طرح ساری قوم بلکہ ساری دنیا کی خدمت کر رہا ہوں۔ اسی کا نام محبت ہے اور یہی انسانیت ہے۔

ہر فعل کی نوعیت نیت پر منحصر ہوتی ہے۔ مثلاً اگر میں دوسروں کی تکلیف کا لحاظ کئے بغیر اپنے خاندان کی غلط خدمت انجام دوں جیسے فرض کیجیے کہ میں کوئی ایسی ملازمت یا کاروبار کرلوں جس میں دوسروں سے زبردستی روپیہ حاصل کیا جائے تو میں اپنے خاندان کو مالا مال

کر دوں گا اور اُس کی تمام ناجائز ضروریات بھی پوری کر دوں گا لیکن حقیقت میں نہ تو یہ خاندان کی صحیح خدمت ہوئی اور نہ ملک و قوم کی۔ بخلاف اس کے اگر میں یہ کہوں کہ خدا نے مجھے ہاتھ پیر اس لئے دیے ہیں کہ میں صرف اپنی اور اپنے متعلقین کی پرورش کروں تو گویا میں اپنی زندگی کو سادہ اور آسان تر بناتا ہوں۔ اس طرح مجھ سے کسی کو نقصان نہیں پہنچے گا۔ اور صرف اپنے قریب ترین لوگوں کی خدمت انجام دوں گا۔ تصور کیجیے کہ اگر ہر شخص یہی طرزِ عمل اختیار کر لے تو ملک کی حالت کتنی بہتر اور قابلِ رشک ہو جائے گی۔ یہ صحیح ہے کہ سب کے سب بیک وقت اس پر عمل نہیں کر سکتے لیکن جو کریں گے وہ بہرحال منزلِ مقصود کو قریب تر کرنے میں ممد ثابت ہوں گے اگر میں تمام دوسرے ممالک کو نظر انداز کر کے صرف ہندوستان کی خدمت کرنا چاہوں تو میرے اس طرزِ عمل سے کسی ملک کو نقصان نہیں پہنچے گا۔ کیونکہ میری خدمت مقابلے کی نوعیت کی نہ ہوگی" اپنی چیز کو اس طرح استعمال کرو کہ اُس سے دوسرے کو تکلیف نہ پہنچے" یہ نہ صرف ایک اعلیٰ قانونی نظریہ ہے بلکہ ایک زرین اصول ہے۔ اہنسا اور محبت پر عمل کرنے کا ایک معقول ذریعہ ہے۔ ہم اس عقیدے کے علمبردار ہیں اس لئے ہمیں اپنے عمل سے یہ ثابت کرنا چاہیے کہ وہ وطن پرستی جس کی بنیاد محبت پر قائم ہو حیات بخش ہوتی ہے لیکن جس کی بنیاد نفرت پر ہو وہ روح کو فنا کر دیتی ہے(۱)"

گویا سودیشی کی تحریک اپنے مفہوم میں پوری وسعت رکھتی ہے۔ جب ہمیں یہ تسلیم ہے کہ ساری دنیا ایک "کُل" ہے اور اس کے تمام اجزا ایک دوسرے سے بہت زیادہ منسلک ہیں تو سودیشی کا مفہوم یہ ہوا کہ ایک محدود حلقے کی خدمت ساری دنیا کی خدمت کے مترادف ہے بشرطیکہ اس کا بھی لحاظ رکھا جائے کہ دوسروں کو بھی اسی طرح اپنے محدود حلقے کی خدمت کا حق حاصل ہے۔

اسی اصول کے مطابق پھر یہ سوال ہی پیدا نہ ہوگا کہ چند بہتر اور زیادہ اہل پیدا کرنے والے دوسروں سے ناجائز فائدہ اٹھائیں گے یا انھیں اپنا غلام بنائے رکھیں گے کیونکہ جیسا کہ ہم

---

(۱) خیالات مہاتما گاندھی از سی۔ ایف۔ انڈریوز ص ۱۲۶-۱۲۷

پہلے بھی عرض کر چکے ہیں اس حالت میں پیداوار تو صرف مقامی ضروریات تک محدود ہوگی۔ اور موجودہ سرمایہ داری کی سی حرص اور خود غرضی کا کوئی موقع ہی نہ ہوگا۔ علاوہ ازیں مانگ کے مطابق پیداوار مساوی طور پر تقسیم ہوگی جب پیداوار مساوی ہوگی تو منافع بھی مساوی ہوگا جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ دولت صرف چند افراد کے پاس جمع نہ ہو سکے گی۔ آمدنی کی افراط اور تفریط جاتی رہے گی، جس کی وجہ سے افلاس اور فاقہ کشی کی مصیبت دور ہو جائے گی اور سب کو کافی خوراک ملنے لگے گی۔

البتہ ایک گاؤں دوسرے گاؤں سے مختلف چیزوں کا تبادلہ کیا کرے گا کیونکہ ہر گاؤں دنیا کی ساری چیزیں نہیں تیار کر سکتا۔ اور اگر اس کی کوشش بھی کرے تو ناممکن ہوگا کیونکہ ہر جگہ کے مقامی حالات اور خام پیداوار مختلف ہوتی ہے۔ لیکن یہ تجارت یک طرفہ نہ ہوگی بلکہ باہمی ہوگی تاکہ کوئی گاؤں پیداوار کا ایسا مرکز نہ بن جائے جس سے دوسرے گاؤں کو نقصان پہنچے۔ اور ان کا روزگار جاتا رہے۔ یہاں یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ یہ چیز کیسے حاصل ہوگی۔ اس کا جواب صاف ہے۔ اگر سودیشی کی اہمیت عوام کے ذہن نشین کر دی جائے اور رائے عامہ کو اس کے لئے تیار کر لیا جائے تو یہ مسئلہ بہت آسان ہو جائے گا۔ کیونکہ لوگ خود بخود قریب کی تیار شدہ چیزوں کو دور کی آئی ہوئی چیزوں کے مقابلے میں ترجیح دیں گے۔ لیکن اس دوران میں دیہاتی پنچایتوں کو از روئے قانون یا بذریعہ محصول اس کا انتظام کرنا ہوگا کہ باہر کی چیزیں بلاضرورت نہ آنے پائیں۔ اس سے نہ صرف گاؤں کا اقتصادی توازن قائم رہے گا بلکہ لامحدود ذاتی منافع حاصل کرنے کی کوششوں کا بھی قلع قمع ہو جائے گا۔ پیداوار کی عدم مرکزیت کی بدولت جب ہر گاؤں اپنی ضروریات کے لائق خود پیدا کرے گا تو بازاروں کے لئے مقابلہ مفقود ہو جائے گا اور جب بازاروں کا مقابلہ نہ ہوگا تو جنگ یا اجتماعی تشدد کی بھی ضرورت نہ پڑے گی۔ اس طرح ملک میں خصوصاً اور ساری دنیا میں عموماً امن و خوش حالی کا دور دورہ ہوگا۔ علاوہ ازیں چونکہ عدم مرکزیت کے مطابق ہر مزدور کو یہ آزادی حاصل ہوگی کہ وہ جو چاہے اور جس طرح چاہے تیار کرے۔ اس لئے اختراعی کوشش

اور انفرادی ترقی کے لئے بھی کافی میدان ملے گا۔ فرمائیے کسی سماجی نظام سے اس سے زیادہ اور کیا توقع ہو سکتی ہے۔

لہذا انہی اصولوں پر ہمیں اپنی قومی زندگی کی داغ بیل ڈالنا چاہئے کیونکہ یہ نہ صرف سرمایہ داری اور اشتراکیت کے معائب کا انسداد کرتے ہیں بلکہ ہمارے آبا و اجداد کی یادگار بھی ہیں۔ ہم پہلے بھی اس جانب اشارہ کر چکے ہیں کہ ہمارا قدیم دیہی نظام لامحدود ذاتی منافع کا سخت مخالف تھا۔ اور اس کا حامی تھا کہ آمدنی میں افراط تفریط نہ ہو تاکہ سب کو کھانے پینے کے لئے کافی ملجائے اور ہر گاؤں اپنے طور پر مستغنی بالذات ہو جائے۔ ہمارے نزدیک یہ تمام باتیں پیداوار کی مرکزیت کو مٹانے سے اور مذکورہ بالا طریقہ پر سودیشی پر عمل کرنے سے حاصل ہو سکتی ہیں (باقی)

۴۔ آل انڈیا ویلیج انڈسٹریز ایسوسی ایشن

تاریخ اور اس کا دستور اساسی وغیرہ

ان مقاصد کو عملی جامہ پہنانے کے لئے گاندھی جی نے ایک آل انڈیا ویلیج انڈسٹریز ایسوسی ایشن (تمام ہندوستان کی انجمن صنایع دیہی) کے قیام کی ضرورت کو محسوس کیا چنانچہ اُن کے ایما سے انڈین نیشنل کانگریس نے اپنے اڑتالیسویں سالانہ اجلاس منعقدہ بمبئی ۲۷ر اکتوبر ۳۴ء میں حسب ذیل تجویز منظور کی۔

”چونکہ اس وقت ملک کے ہر حصہ میں ایسی انجمنیں اور ادارے قایم ہو رہے ہیں جو سودیشی کو فروغ دینے کے مدعی ہیں اور اُن میں بعض کانگریس سے امداد حاصل کرتے ہیں اور بعض خود مختار ہیں۔ اور چونکہ عوام کے لئے سودیشی کی صحیح ماہیت کا سمجھنا مشکل ہو گیا ہے۔ نیز چونکہ کانگریس شروع ہی سے عوام کی ترجمانی کرتی چلی آئی ہے اور دیہات کی تنظیم اور سدھار تو کانگریس کے تعمیری پروگرام میں داخل ہی ہے اور چونکہ اس قسم کی اصلاحی کوششوں کا لازمی نتیجہ کھدر اور چرخہ کے ساتھ ساتھ دیہات کی دوسری مردہ اور قریب المرگ صنعتوں کو زندہ کرنا اور اُن کو ترقی دینا ہوگا اور ظاہر ہے کہ اس کام کو کھدر اور چرخہ کی ترویج کی طرح صرف ایسی متحدہ اور غیر معمولی جد و جہد سے کیا جا سکتا ہے جو کانگریس کی سیاسی سرگرمیوں سے آزاد اور اُن کے اثرات سے مامون ہو۔ اس بنا پر شری جے۔ سی۔ کمار اپا کو یہ اختیار دیا جاتا ہے کہ وہ گاندھی جی کے مشورہ سے آل انڈیا ویلیج انڈسٹریز ایسوسی ایشن کے نام سے ایک ادارہ قایم کریں جو کانگریس کی سرگرمیوں کا ایک جزو ہو۔ ایسوسی ایشن مذکور دیہاتی صنعتوں کے احیا اور ان کی ترقی اور دیہاتیوں کی اخلاقی

اور جسمانی اصلاح کی کوشش کرے گی اور اُسے اپنا دستور اساسی بنانے۔ سرمایہ فراہم کرنے اور اپنے کام کو چلانے کے لئے مناسب ذرایع اختیار کرنے کا حق ہوگا۔

اس تجویز کے مطابق ۱۴ر دسمبر ۳۴ء کو ایسوسی ایشن کی تشکیل عمل میں آئی اور اس کا نام آل انڈیا ویلیج انڈسٹریز ایسوسی ایشن یا اکھیل بھارت گرام اودیاگ سنگھ یا تمام ہندوستان کی انجمن صنایع دیہی قرار پایا، اس کا مقصد دیہات کی تنظیم دیہاتی صنعتوں کا احیاء اور ترقی اور دیہاتیوں کی اخلاقی اور جسمانی سدھار ہے۔ ایسوسی ایشن یہ سب کام گاندھی جی کی سرپرستی میں کرے گی۔

ایسوسی ایشن مذکوران ارکان پر مشتمل ہے۔

امناء۔ تاسیسی ارکان۔ انتظامی بورڈ۔ معمولی ارکان۔ نمائندے۔ اعزازی کارکن تنخواہ دار کارکن۔ شرکار اور مجلس مشاورت ان کے علاوہ ہوگی۔

امناء دوامی امناء کا بورڈ جو چھ اشخاص پر مشتمل ہے ایسوسی ایشن کے سرمایہ اور جائداد کا قانونی نگراں ہے۔ اور انتظامی بورڈ کے حسب ہدایت خرچ کرنے کا مجاز ہے۔

تاسیسی ارکان اور انتظامی بورڈ تاسیسی ارکان کی تعداد آٹھ ہے اور پہلا انتظامی بورڈ ان ہی پر مشتمل ہے یہ ۱۴ر فروری ۳۵ء سے ، سال تک انتظامی بورڈ کے رکن رہیں گے اور بورڈ ہی ایسوسی ایشن کے جملہ کاموں کا ذمہ دار ہے۔

معمولی ارکان معمولی رکن کے لئے ضروری ہے کہ رکنیت کے شرائط نامہ کی تصدیق کے ساتھ انتظامی بورڈ کا ایک رکن اس کی سفارش بھی کرے اور اس کے بعد بورڈ اُس کی رکنیت کو تسلیم کرلے۔ معمولی رکن کو ہر تیسرے مہینہ اپنے کام کی رُوداد سیکریٹری کے پاس ارسال کرنا ہوگی۔

نمائندے نمائندے معمولی ارکان میں سے منتخب کئے جائیں گے اور یہ انتخاب انتظامی بورڈ کرے گا نمائندے اپنے اپنے حلقہ کی نمائندگی کے فرائض ادا کریں گے۔ اور ان کا انتخاب اپنے علاقہ سے واقفیت انتظامی قابلیت اور مقامی اثر و رسوخ کی بناء پر ہوگا۔ دراصل یہی نمائندے ایسوسی ایشن کے اصل کارکن ہوں گے۔ یہ لوگ اپنے اپنے ضلعوں میں ایسوسی ایشن کی شاخیں کھولیں گے۔ انھیں اپنے کام کرنے

سرمایہ جمع کرنے کا حق ہوگا لیکن وہ اس کو ذاتی ضرورتوں پہ خرچ کرنے کے مجاز نہ ہوں گے اور نہ ہی ایسوسی ایشن کے مرکزی دفتر سے انھیں کوئی امداد ملے گی۔ ان نمائندوں کو ماہ بماہ اپنے کام کی رُوداد اور آمد و خرچ کا حساب مرکز میں بھیجنا پڑے گا۔

اعزازی کارکن اعزازی کارکن نمائندوں اور معمولی ارکان کے علاوہ ہیں۔ ان کا کام یہ ہے کہ وہ دیہات کی بنی ہوئی چیزیں خود استعمال کریں اور دوسروں میں اُن کا پرچار کریں اور دیہاتیوں کی جو خدمت اُن کے بس میں ہو کریں اُن کو ہر تیسرے مہینہ اپنی کارگذاریوں کی رُوداد مرکزی دفتر میں پیش کرنا ہوگی۔

تنخواہ دار کارکن اُن کارکنوں کے علاوہ جو ضلعوں کے نمائندے خود مقرر کریں گے اور خود ہی اُن کو تنخواہ دیں گے نیز ایسوسی ایشن کے مرکزی دفتر کے ملازموں کے ماسوا بورڈ ایسے کارکن بھی ملازم رکھے گا جو دیہاتوں میں آباد ہو کر ایسوسی ایشن کے پروگرام کے مطابق سدھار کا کام کریں گے۔ یہ کارکن عام طور پر ایسے علاقوں میں مقرر کئے جائیں گے جہاں پہلے سے ایسوسی ایشن کے نمائندے نہ ہوں گے۔ ان کارکنوں کو گذر اوقات کے لئے دس روپے ماہوار دئے جائیں گے۔

شرکاء ہر شخص جو ایسوسی ایشن کے مقاصد سے ہمدردی رکھتا ہے اور اُسے کم از کم سو روپیہ سالانہ چندہ دیتا ہے وہ ایسوسی ایشن مذکور کا شریک متصور ہوگا۔ اور جو شخص ایک ہزار روپیہ یکمشت دے گا وہ ایسوسی ایشن کا شریک دائمی سمجھا جائے گا۔

مشیر مشیر وہ ہیں جو اپنی ذاتی مصروفیتوں کے باوجود ایسوسی ایشن کو ضرورت کے وقت مفید مشوروں سے بلا معاوضہ ممنون کریں۔

ان شعبوں کے علاوہ ایسوسی ایشن اپنے پروگرام میں ملحقہ اداروں اور منظور شدہ اداروں سے بھی کام لے گی۔

ملحقہ ادارے ملحقہ اداروں میں آشرموں، اور اس قسم کی دوسری قومی انجمنوں کا شمار ہوگا جن کا مقصد دیہات کی اصلاح اور دیہاتیوں کی خدمت کرنا ہے اور نیز اُن کے اغراض و مقاصد میں کوئی بات ایسی نہ ہو جس سے ایسوسی ایشن سے اصولاً تضاد واقع ہوتا ہو۔

منظور شدہ ادارے منظور شدہ اداروں سے مراد وہ دکانیں اور اشخاص ہیں جو ایسوسی ایشن کے زیر اثر دیہات کی بنی ہوئی چیزیں مہیا کریں اور اُن کو فروخت کریں۔ یہ لوگ ایسوسی ایشن کے تجارتی کارندے ہوں گے اس وقت تک ایسوسی ایشن کی طرف سے حسب ذیل اشیا کی خرید و فروخت کے متعلق اجازت نامے دئے جا چکے ہیں۔ چکّی کا پسا ہوا آٹا۔ گڑ۔ شہد۔ ہاتھ کا نکالا ہوا چاول۔ کولھو کا تیل۔ ہاتھ کا بنا ہوا کاغذ۔ گھی۔ دال اور خشک پھل۔

مالیات ایسوسی ایشن کا نصب العین لا مرکزیت ہے اور وہ نہایت خلوص سے اُس پر عمل پیرا ہے۔ چنانچہ اُس نے اپنے پروگرام میں مقامی طور پر مالی امداد کا انتظام کیا ہے۔ اُس کے نمائندے اپنے کام کے لئے اپنے اپنے حلقوں سے چندہ فراہم کریں گے البتہ ایسوسی ایشن کا مرکزی دفتر اپنے ہمدردوں کی عطیات یا چندے قبول کرتا ہے اور نیز اُسے اپنے معمولی شرکار اور دائمی شرکار سے سالانہ چندے بھی وصول ہوتے ہیں، امید ہے آگے چل کر مرکزی دفتر کا کام ملحقہ اداروں اور منظور شدہ اداروں کی فیسوں سے چل جایا کرے گا۔

ارکان کی تعداد ۷ر نومبر ۳۵ء تک ایسوسی ایشن کے مختلف ارکان کی تعداد حسب ذیل تھی۔

معمولی ارکان	۴۲۳	منظور شدہ دکانیں	۲۷
نمائندے	۶۱	ملحقہ ادارے	۵

نشر و اشاعت ایسوسی ایشن نے جن چیزوں کے متعلق اس وقت تک قابل اعتماد معلومات فراہم کی ہیں اُن پر چھوٹے چھوٹے رسالے شائع کئے ہیں۔ نیز ایسے اغراض و مقاصد کی نشر و اشاعت کے سلسلہ میں اخبارات اور رسائل میں مضامین لکھے گئے ہیں اور اس وقت ہفتہ وار "ہریجن" ایسوسی ایشن کا ترجمان ہے۔ یہ اخبار انگریزی۔ گجراتی اور ہندی میں شائع ہوتا ہے۔ کارکنوں کو چاہئیے کہ وہ مفید مشوروں کے لئے اس کا مطالعہ کریں۔

انجمن کا پروگرام ظاہر ہے کہ دیہات کے تمام مسائل کو سلجھانا ایسوسی ایشن کے بس میں نہیں۔ مزید برآں بعض مسائل تو صرف حکومت کے کرنے کے ہیں کیوں کہ اُن کے لئے تمام ہندوستان پر سیاسی اور اقتصادی اختیارات

کی ضرورت پڑتی ہے۔ ان حالات میں ضروری ہے کہ ایسوسی ایشن اپنے دائرہ عمل کو صرف اُن طریقوں تک محدود رکھے جن کا انحصار شخصی انتظام اور ذاتی اختیار پہ ہو۔ اور اس میں حکومت کے اداروں اور اثر و نفوذ کی ضرورت نہ پڑے۔

اس میں شک نہیں کہ ہر اُس ادارہ کو جس کا مقصد دیہات کی اصلاح ہے سب سے پہلے دیہاتیوں کی جسمانی حالت کی طرف توجہ کرنا ہوگی کیوں کہ دیہاتی ہی گاؤں کی تمام سرگرمیوں کا مرکز ہے اور جب تک اُس کی جسمانی حالت اچھی نہ ہوگی گاؤں کی اصلاح کی امید رکھنا بے کار ہے۔ اس امر کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایسوسی ایشن نے سب سے پہلے گاؤں کی صفائی کو لیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب تک گاؤں کی گلیاں۔ بازار اور میدان صاف نہ رکھے جائیں گے اور آب رسانی کا اچھا انتظام نہ ہوگا گاؤں والے آئے دن بیماریوں اور وباؤں کا نشانہ بنے رہیں گے جو اُن کی رہی سہی قوت کو بھی ختم کر دے گی، بہر حال وہ لوگ جو دیہاتیوں کا بھلا چاہتے ہیں اُن سے ایسوسی ایشن کی درخواست یہ ہے کہ وہ سب سے پہلے گاؤں کی صفائی کا کام شروع کریں۔ اور وہ اس طرح کہ گاؤں میں معمولی طور پر راستے بنائیں۔ گلیوں کو گندگی کے ڈھیروں سے جو مکھیوں اور بیماریوں کے جراثیم کا گھر ہوتے ہیں پاک کریں۔ پاخانوں کی غلاظت کو کام میں لانے کے لئے نئے اصلاحی طریقے رائج کریں اور گاؤں کے تالابوں اور کنوؤں کو صاف کیا جائے۔ اور دیہاتیوں کو حفظان صحت کے طریقوں اور تھوکنے۔ کمروں کی روشنی اور صفائی کی ضرورت۔ کپڑوں اور کھانے پکانے کے بارے میں مناسب ہدایات دی جائیں۔

اس کے علاوہ ایسوسی ایشن مذکور خوراک کی اصلاح کے متعلق غور و خوض کر رہی ہے۔ وہ کھانے کی ایسی مناسب نوعیت معلوم کرنا چاہتی ہے جو دیہاتیوں کی گرہ کے مطابق ہو اور اُس میں غذائیت کے ضروری اجزا بھی ہوں۔

کسان کی اہلیت پیداوار اچھی خوراک نہ ملنے کی وجہ سے بھی گھٹ گئی ہے۔ لہذا یہ ضروری ہے، کہ اس کے کھانے میں زندگی بخش عناصر کو شامل کیا جائے، ورنہ جو کچھ اُسے ملتا ہے کم از کم اُس کی غذائیت تو نہ گھٹنے پائے اگر وہ چاول کو تھوڑی سی دال بھات کے ساتھ نگل کر ہی گزر کرتا ہے، تو اس بات کا خیال رکھنا چاہیئے، کہ وہ

چاول سے پورا فائدہ اٹھالے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے، اس کو یہ بتانا چاہیئے کہ کتنے چاول کے لئے کتنا پانی کافی ہے۔ کیوں کہ چاول اُبالنے کے بعد جو زاید پانی پھینک دیا جاتا ہے، اس میں بہت سی غذائیت موجود ہوتی ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ اُسے ہاتھ کا کوٹا ہوا چاول استعمال کرنا چاہیئے۔ اس سے صرف یہ فائدہ نہیں ہوتا کہ وہ اپنا روپیہ مِل کی نذر کرنے سے بچ جاتا ہے، بلکہ یہ طبّی نقطۂ نظر سے بھی مفید ہے، کیونکہ مِل کی گرمی سے وٹامن (ب) ضائع ہو جاتا ہے۔ چاول کو صاف نہیں کرنا چاہیئے، کیونکہ ایسا کرنے میں، چاول کا رنگ بگڑ جاتا ہے، اور دراصل اسی میں وٹامن (ب) موجود ہوتا ہے، جو کہ غذائیت رکھنے کے علاوہ بیری بیری سے بھی محفوظ رکھتا ہے۔ سارے طبیب، اس امر پہ متفق ہیں کہ ناصاف چاول، صاف کئے ہوئے چاول سے کہیں بہتر ہوتا ہے۔ کیونکہ اس میں پروٹین، چربی اور معدنیات نسبتہً زیادہ ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ ناصاف چاول سے کبھی قبض نہیں ہوتا، درآنحالیکہ صاف چاول ہمیشہ قبض کرتا ہے۔ ان اسباب کے پیش نظر، ایسوسی ایشن اس امر پہ زور دیتی ہے کہ ہر وہ شخص جس کو کسانوں کے دُکھ درد کا احساس ہو، وہ خود بھی ناصاف، ہاتھ کا کوٹا ہوا چاول کھائے، اور کسانوں کو بھی اس کی تلقین کرے۔ مزید برآں طب کا یہ بھی تقاضا ہے کہ ہاتھ کا پسا ہوا گیہوں اور سادہ گڑ، مشین کے آٹے اور نفیس شکر سے بہت زیادہ مفید ہیں۔ اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ مشین کی گرمی، ان کی غذائیت کو زایل کر دیتی ہے۔ چنانچہ ایسوسی ایشن ہاتھ کے پسے ہوئے گیہوں اور گڑ کے استعمال کرنے کا پروپیگنڈا کرتی ہے۔ علاوہ ازیں، ایسوسی ایشن کے زیر نگرانی عام اناج، ساگ، پھلوں اور سبزیوں پہ تحقیق کی جا رہی ہے، تاکہ کسانوں کے لئے کوئی متوازن خوراک مقرر کر دی جائے، ایسوسی ایشن امید کرتی ہے کہ وہ ان طریقوں سے کسانوں کے فاقہ زدہ جسموں میں نئی زندگی اور جان ڈال دے گی۔

ایسوسی ایشن کی کارکردگی یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ اس کے نام ہی سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا پہلا کام کسانوں کی معاشی زندگی کو سدھارنا ہے۔ آج کسان بڑی ہی بری حالت میں ہے۔ یقینی طور پہ کہا جا سکتا ہے کہ اُس کے ہاتھ میں کوئی فائدہ مند پیشہ نہیں رہا۔ جب سے بڑے پیمانہ کی مشنری آگئی ہے، اس کی سب چھوٹی چھوٹی صنعتیں جو پہلے اس کی ضروریات کی کفالت کرتی تھیں، برباد ہو گئی ہیں۔ چنانچہ اب اس کا ایک ہی

سہارا ہے، یعنی زمین لیکن یہاں بھی ایک مصیبت آپڑی ہے، آدمی زیادہ ہیں اور زمین بہت کم۔ پھر کیا کیا جائے؟

اس نقطہ پر پہنچ کر، "دیہاتی صنعتوں کی ایسوسی ایشن" کو یہ لازم آتا ہے کہ وہ گاؤں کی موجودہ صنعتوں کے واقعی حالات کا مطالعہ کرے۔ اُن میں سے جو پھل پھول رہی ہیں، جو مر رہی ہیں یا مر چکی ہیں، سب کو غور سے دیکھے۔ مقامی حالات سے ہم آہنگ صنعتوں کو رائج کرے، از سر نو زندہ کرے یا اُن کو ترقی دے پھر ان کی زاید پیداوار کے لئے نئی منڈیاں ایجاد یا تخلیق کرے۔ ایسا کرنے میں، دِساور کی مشین سے بنی ہوئی صنعتوں کے ساتھ مقابلہ نہیں ہوگا، کیوں کہ باہر کی منڈیوں سے مقابلہ کرنا، ہمارے سودیشی آیڈیل کے خلاف ہے۔ سودیشی کا یہ مقصد ہے کہ دیہاتی، اپنی ضروریات کے مطابق، اپنے ہاتھ سے چیزیں تیار کرلیں۔ آخر ہم اپنے ہاں کی روئی کو، کپڑا بُننے جاپان یا لنکا شائر کیوں بھیجیں، جب کہ دیہاتی یہ کام خود سر انجام دے سکتے ہیں؟ کیا ایک وہ غریب آدمی، جس کی آمدنی دس روپے ماہوار سے بھی کم ہو، اپنے کپڑوں کی دُھلائی صفائی یورپ میں کرائے گا؟ کتنا لغو خیال ہے۔ غریب آدمی کو اپنے کپڑے خود ہی دھو لینے چاہئیں اس کے بس کی بات نہیں ہے، کہ وہاں کی مہنگی مزدوری، اور کرایہ وغیرہ اور کثیر اخراجات کا متحمّل ہو سکے۔ لیکن غریب دیہاتی ہمیشہ اس لغویت کا شکار رہتا ہے، وہ اپنی خام پیداوار کو یورپ بھیجتا ہے اور جو چیزیں وہاں سے بن کر آتی ہیں، ان کو استعمال کرتا ہے۔ حالانکہ اس کی قطعی ضرورت نہیں ہے، وہ یہ سارا کام خود کر سکتا ہے۔ اس صورت حالات سے یہ المناک نتیجہ نکلتا ہے کہ دیہاتی پر دوہرا ظلم ہوتا ہے۔ اس کو تیار شدہ چیز کے لئے زاید روپیہ دینا پڑتا ہے، اور وہ کام کاج سے بھی محروم رہتا ہے۔ یہ بات کہنے میں کتنی بھلی معلوم ہوتی ہے کہ جاپان اور لنکا شائر دیہاتی کو خود کپڑا تیار کرنے کی زحمت سے بچا لیتے ہیں۔ یہ دلیل صرف ان لوگوں کے لئے کچھ معنی رکھتی ہیں، جن کی آمدنی کے ذرائع دیہات کی پیشوں سے مختلف ہیں۔ لیکن ہندوستان میں اس جماعت کی تعداد بہت ہی قلیل ہے۔ آبادی کا زیادہ تر حصہ کسانوں پر مشتمل ہے، جو ایڑی چوٹی کا پسینہ بہا کر، اپنی روٹی کماتے ہیں۔ ان کے لئے ایک پائی بھی بہت زیادہ قیمت رکھتی ہے اور اگر ان کو کام کرنے کا کوئی موقع نہ ملے۔ تو یہ ان کی موت کے مُرادف ہے۔ اس وجہ سے ایسوسی ایشن اس امر کو اپنا اولین فرض سمجھتی ہے، کہ ہندوستان کی خام اجناس، باہر نہ جانے پائیں، دیہاتی خود اپنے ہاتھ سے کام کرے۔ اپنی ضروریات کو

پیدا کرلیں۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ گاؤں کی دولت جو باہر کے ملکوں کی طرف بھیجی جاتی ہے، اس کا رُخ پھر گاؤں کی طرف موڑ دیا جائے تاکہ دیہاتیوں کی حالت بہتر ہو جائے۔ قدیم زمانہ میں، ہندوستانی گاؤں خود اپنی ضروریات مہیا کر لیا کرتے تھے اور ان کی روئی، سلک، دری، پیتل اور ہاتھی دانت وغیرہ کی صنعتیں، دوسرے ملکوں کے لئے باعثِ رشک تھیں۔ پھر کوئی وجہ نہیں ہے کہ آج ہندوستان صرف ایک زراعتی ملک ہی بن کر رہ جائے۔ اور اس سے بھدی بات یہ ہے کہ اگر گاؤں کے لوگوں کی صنعت سے محرومی برابر جاری رہی تو عوام کی حالت بالکل تباہ ہو جائے گی اب بھی یہ عالم ہے کہ وہ فاقوں میں مبتلا ہیں۔ اگر اس طریقہ کار کی روک تھام نہ کی گئی۔ اور دیہاتیوں کو زراعت کے ساتھ ساتھ اور پیشے نہ سکھائے گئے تو ان کے لئے مستقبل میں کوئی اُمید باقی نہیں رہتی۔

اس کے تسلیم کرنے میں کوئی امر مانع نہیں ہے۔ لیکن یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس تباہی سے بچنے کے لئے، قدیم دیہاتی صنعتوں کی طرف رجوع نہیں کرنا چاہیئے بلکہ تمام ہندوستان میں نئی بڑے پیمانے کی مشینری کو فروغ دینا چاہیئے، جو کہ دیہات کے بے کاروں کو اپنے میں جذب کر لیں گی۔ اس تجویز میں یہ نقص ہے کہ یہ ہمارے ملک کے مخصوص حالات کے مطابق نہیں ہے۔ کسان زمین کو چھوڑ کر کارخانوں میں کام نہیں کر سکتا کیونکہ زمین اُس کی توجہ کی طالب ہے۔ اس کو دراصل، اس چیز کی شدید ضرورت ہے کہ جب اُسے کھیتی باڑی کے کام سے فراغت ہو، تو وہ عارضی طور پر کسی صنعت کو لے بیٹھے۔ علاوہ ازیں، فیکٹریاں محض کہہ دینے سے تو بن نہیں جاتی ہیں اور ہمارے یہاں بے روزگاری اس قدر عام ہے، کہ اس کو دور کرنے کے لئے بے شمار فیکٹریاں بنانا پڑیں گی، بفرضِ محال اگر آدمی کارخانوں میں کھپ بھی جائیں تو مصنوعات کو بیچنے کے لئے منڈی کہاں ملے گی؟ دنیا میں پہلے ہی زائد پیداوار کا طوفان آیا ہوا ہے اور منڈیاں حاصل کرنے کے لئے شدید مقابلہ جاری ہے۔ اس وجہ سے فیکٹریاں بڑھا دینے کا خیال، قطعاً ناقابلِ عمل ہے۔ اور فیکٹری لگانا تو اُس حالت میں مفید ہوتا ہے، جب مزدور کم ہوں، اور مال کی مانگ زیادہ ہو لیکن ہم بالکل برعکس حالت سے دوچار ہیں۔ ہمارے ملک میں ایک طرف تو لاکھوں ایسے آدمی ہیں، جنھیں کوئی کام نہیں ملتا، اور دوسری طرف قطع نظر اس امر سے کہ ہم چاہیں یا نہ چاہیں، لیکن بہت زیادہ سستا مال باہر سے آتا رہتا ہے۔ جو مسئلہ

ہمیں درپیش ہے وہ محنت کو بچانے کا نہیں، بلکہ اس کو کہیں نہ کہیں لگانے کا ہے۔ یہ خواہش کارخانے نہ جانے سے پوری نہیں ہوسکتی کیوں کہ اُن میں تو آبادی کا ایک قلیل حصہ جذب ہوسکتا ہے۔ اس مشکل کا ایک ہی حل ہے، یعنی دیہاتیوں کو ایسی صنعتیں سکھائی جائیں، تاکہ وہ اپنی ضروریات کو آسانی سے مہیا کرسکیں، اور انھیں دور دراز نہ بھٹکنا پڑے۔ اس طرح سے ساری پیداوار گاؤں کے بہت سے خاندانوں میں بٹ جائے گی، اور جب پیداوار اس طرح سے بٹ جائے تو جیسا کہ اب ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف دولت تھوڑے سے آدمیوں کے پاس جمع نہیں ہوسکے گی۔ آدمی، اپنے لئے اور اپنے قریبی پڑوسیوں کے لئے کام کریں گے اور تجارتی سرمایہ داروں اور برآمد کرنے والے تاجروں کی محنت سے ناجائز فایدہ نہ اٹھا سکیں گے۔ گاؤں کے آدمیوں کو برآمد کرنے والے نہ ان کی اشیاء خام سے محروم کرسکیں نہ وہ غیر ملکیوں پر اپنی ضروریات رسد کے لئے انحصار کریں گے بلکہ وہ صرف اپنی ذلت پر بھروسہ کریں گے اور اپنی ابتدائی احتیاجات کو اپنی محنت سے پورا کریں گے اور زاید پیداوار کو فروخت کریں گے اس نظام میں گاؤں والوں سے ناجائز نفع حاصل نہ کیا جائے گا اور وہ ان تاجروں سے جو ان سے تجارتی اغراض کے لئے مال پیدا کرانا چاہیں گے ” ہمیں جس چیز کی ضرورت ہے ہم اس کے پیدا کرنے پر بالکل قانع ہیں اگر تم اپنے لئے ہم سے دولت پیدا کرانی چاہتے ہو تو تمھیں جو دام ہم مانگیں وہی ادا کرنا پڑیں گے“ چنانچہ ایسوسی ایشن کا مقصد اس طرح صنعتوں کو زندہ یا جاری کرکے دیہاتی کو مستغنی بنانا ہے تاکہ وہ سہولت کے ساتھ اپنی ضرورت کی تمام چیزیں خود پیدا کرسکے۔

اس کا جواب یہ دیا جاسکتا ہے کہ ہم کسی ایسے حصہ زمین پر نہیں رہ رہے ہیں جو دنیا سے بالکل الگ تھلگ ہو ہم چاہیں یا نہ چاہیں کارخانوں کی بنی ہوئی اشیا کثیر تعداد میں آئیں گی اور گاؤں کی اشیاء کے لئے ان سے مقابلہ کرنا ممکن نہ ہوگا۔ لیکن جیسا کہ ابھی بیان کیا جاچکا ہے ایسوسی ایشن کا مقصد مقابلہ میں شریک ہونا نہیں ہے بلکہ صرف ذاتی اور اپنے قریبی ہمسایوں کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے دولت پیدا کرنا ہے۔ مثلاً میں کاتتا ہوں اور اپنے لئے کافی کپڑا بنا لیتا ہوں۔ پھر جب میں کھدر صرف اپنے لئے تیار کرتا ہوں تو کارخانہ کے کپڑے کی قیمت سستے ہونے کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا کیوں کہ میں اپنے کپڑے کے لئے کوئی نقد رقم ادا ہی نہیں کرتا ہوں۔ لیکن

یہ کہا جا سکتا ہے کہ دیہاتی بذات خود تمام اُن چیزوں کو جن کی اسے ضرورت ہے پیدا نہیں کر سکتا۔ اُسے ان چیزوں کو جنھیں وہ خود پیدا نہیں کر سکتا (مثلاً کاغذ، جوتا) کھلے بازار خریدنا پڑے گا اور ان حالات میں گاؤں کا بنا ہوا کاغذ اور جوتا کارخانے کی بنی ہوئی اشیاء سے مقابلہ کرنے لگیں گے۔ اس کا جواب ہمارے پاس یہ ہے کہ وقت گذرنے اور پیداوار کے طریقوں میں ترقی ہو جانے کے بعد گاؤں کی بنی ہوئی اشیاء کارخانوں کی بنی ہوئی اشیاء سے گھٹیا نہ رہیں گی۔ بلکہ اس کے برخلاف بجا طور پر یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ ان کی قدر بالکل اسی طرح بڑھ جائے گی جیسے مغرب میں ہاتھ کی بنی ہوئی اشیاء کو کارخانہ کی پیدا کی ہوئی اشیا پر ترجیح دی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ قیمت کے معاملہ میں بھی یہ دریافت کیا گیا ہے کہ جب مزدور ہندوستان کی طرح کثیر اور سستے ہوتے ہیں تو ہاتھ کی بنی ہوئی اشیاء کارخانہ کی اشیاء کا بخوبی مقابلہ کر سکتی ہیں۔ اس کے علاوہ جب تمام توجہ اور انسانی ذہانت اس بات کے لئے مرکوز کر دی جائے گی کہ ایسی مشینیں ایجاد کی جائیں جو بڑے پیمانہ پر پیداوار حاصل کریں اور انفرادی طور پر چلائی جا سکیں (جیسے سینے کی مشین) جس کا کہ ایسوسی ایشن ارادہ رکھتی ہے تو پیداوار کس آسانی سے بڑھائی جا سکتی ہے اور محنت اور وقت کو بچایا جا سکتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہاتھ کی بنی ہوئی اشیاء اتنی ہی سستی ہو جائیں گی جیسی کہ کارخانہ کی اشیاء ہوتی ہیں۔ لہٰذا ہمارے پروگرام میں ایسی مشین کو جو مذکورہ بالا سینے کی مشین کی طرح مزدور کی انفرادی طور پر مدد کرے گی خاص اہمیت حاصل ہے۔ لیکن ایسی بڑے پیمانہ کی مشین کی جو پیداوار کو مرکز کے ماتحت لاتی ہے اور مزدور کو غلام بناتی ہے ہمارے یہاں کوئی گنجائش نہیں ہے۔

یہ صحیح ہے کہ ایک ملک کی تمام صنعتیں چھوٹے پیمانہ پر نہیں چلائی جا سکتیں مرکزیت پسند طریقہ پیداوار کی بھی ضرورت رہے گی مثلاً عام منفعت کی صنعتوں میں۔ لیکن یہ پھر افراد کے ہاتھ میں نہیں رہیں گی بلکہ حکومت کے انتظام اور نگرانی میں آجائیں گی اور قطعاً عوام کے مفاد کے لئے کام کریں گی۔ بڑے پیمانہ کی صنعتیں خریداروں کے لئے امداد باہمی کی انجمنیں بھی چلا سکتی ہیں۔ مگر ایسی صنعتیں ایسوسی ایشن کے موجودہ کام میں شامل نہیں ہیں اس لئے ان کے متعلق یہاں بحث نہیں کی جا سکتی۔

سودیشی کے اصول کے مطابق جو صنعتیں دیہات میں چلائی جائیں انھیں دیہاتیوں کی ضروریات سے متعلق ہونا چاہیئے نہ کہ شہریوں اور غیر ملکیوں کی ضروریات سے۔ لیکن بعض حالات میں گاؤں والے ایسی اشیاء بھی پیدا کر سکتے ہیں جن کی انھیں

خود ضرورت نہ ہو بشرطیکہ ان کی فوری طلب موجود ہو (کیوں کہ اس صورت میں بھی پیداوار ایک معلوم طلب سے متعلق ہو جائے گی) نیز دوسری شرط یہ ہے کہ ان کی پیداوار کے لئے اشیاء خام مقامی طور پر موجود ہوں اور ان اشیاء کی پیداوار سے کئی آدمی حیلہ سے لگ سکیں مثلاً گاؤں والے اگر فاؤنٹین پن یا گھڑیاں بنانے لگیں تو اس سے کوئی فائدہ نہیں ہے کیوں کہ ان کے بنانے کے لئے جس مشین اور اشیاء خام کی ضرورت ہے وہ مقامی طور پر دستیاب نہیں ہو سکتیں۔ ان کی طلب شہریوں تک محدود ہے اور اس کے لئے ان سے صرف چند خاندان روزگار سے لگ سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں مغرب نے ان صنعتوں کو مکمل کرنے کے لئے اس قدر فکر اور سرمایہ صرف کیا ہے کہ دیہات والے کامیابی کے ساتھ ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ لیکن مثال کے طور پر گڑ کے پیدا کرنے میں یہ بات نہیں ہے۔ اس کی طلب کثیر ہے اور اس سے بہت سے گاؤں میں کئی کئی خاندانوں کو روزگار مل سکتا ہے۔ ایسوسی ایشن اسی قسم کی صنعتوں کو ترقی دے گی۔

رہا سوال ایسی صنعتوں کا جن میں گاؤں والے تجارتی اغراض کے ساتھ مصروف ہوں ان کے لئے ایسوسی ایشن کا مطالبہ ہے کہ کاریگر کو کمترین اسباب حیات کے لائق اجرت فراہم کرنے کی ضمانت لی جائے۔ چنانچہ وہ موثر طریقے اختیار کر رہی ہے کہ جو اشیاء اس کی معرفت فروخت ہوں ان سے کاریگر کو کم از کم اس قدر اجرت ضرور مل سکے۔ ہمارے ملک میں سب سے کم اجرت والی ایک صنعت سوت کاتنے کی ہے جس سے موجودہ زمانہ میں کاتنے والوں کو ایک پیسہ فی گھنٹہ ملتا ہے اس چیز کو اب اور زیادہ برداشت نہ کیا جائے گا۔ کاتنے والے کو اسباب حیات کے لائق اجرت دی جائے گی اور اس کا تخمینہ یہ معلوم کر کے کیا جائے گا کہ سائنس کی تحقیقات کے مطابق ایک جوان بالغ کے لئے کم از کم غذا کی کس قدر ضرورت ہے یہ بے شبہ صحیح ہے کہ آج گاؤں والوں کی غذا اس کمترین معیار سے بہت کم ہے لیکن ایسوسی ایشن اس بات کو محسوس کرتی ہے کہ جب وہ گاؤں والوں کو اس بات کی تعلیم دینا چاہتی ہے کہ وہ اچھی اور صحت بخش غذا کھائیں تو وہ گاؤں والوں کو اس کی خریداری کے ذرائع بہم پہنچانے سے غفلت نہیں کر سکتی۔ اجرت کی بنیاد ایک کارگزار مزدور کی آٹھ گھنٹے کی محنت ہوگی۔ اس نظام کا یہ لازمی نتیجہ ہوگا کہ کھدر اور گاؤں کی ایسی اشیاء کی قیمت جو مقررہ کمترین اجرت سے کم قیمت پر فروخت ہو رہی ہیں بڑھ جائے گی اور قدرتی طور پر ان اشیاء کی فروخت گھٹ جائے گی لیکن گاندھی جی جو اس تحریک کے روح رواں ہیں اس

بات سے نہیں گھبراتے۔ وہ کہتے ہیں کہ گاؤں والے کے انتقاع ناجائز اور غیر انسانی اجرت سے تو یہ بہتر ہے کہ ان اشیاء کی تجارت تباہ ہو جائے۔ پھر یہ بات بھی مدِنظر رکھنا چاہئیے کہ ہماری اسکیم میں گاؤں والا خود اپنی ضروریات زندگی کو پیدا کرتا ہے جس کی وجہ سے یہ سوال پیدا ہی نہیں ہوتا کہ گاؤں والا اپنی بنیادی احتیاج کو خود فراہم کرنے سے قاصر رہے گا۔ عملاً اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ لوگ جو اپنی ذمہ داری محسوس کرتے ہیں اسے اپنا فرض سمجھیں گے کہ زیادہ قیمتیں ادا کریں تاکہ وہ ایک ایسے نظام کی حمایت نہ کریں جس میں عوام کی مجبوری اور لاچاری سے ناجائز نفع حاصل کیا جاتا ہے۔ کمترین اجرت کو تسلیم کرانے کا محرک ایک اخلاقی جذبہ ہے عملی دشواریاں بے شبہ پیدا ہوں گی۔ لیکن اپنے اقدام کے حق و انصاف میں اعتقاد ہی ان کی تسخیر میں ہماری اعانت کرے گا۔ اور آخر میں ہمیں اس قابل بنائے گا کہ ہم دنیا کو دکھا سکیں کہ حق و انصاف ہی بہترین معاشی اصول ہے۔

ان لوگوں کا جو ایسوسی ایشن سے متعلق ہیں ایک خاص فریضہ یہ بھی ہے کہ وہ گاؤں کی ایک تفصیلی پیمائش کریں کہ یہ معلوم ہو سکے کہ کون سی صنعتیں اس وقت چلائی جا رہی ہیں ان کی حالت کیا ہے، صنعتوں کے لئے کون اشیاءِ خام موجود ہیں اس سے پہلے کون سی صنعتیں رائج رہ چکی ہیں ان صنعتوں کے جو طریقے تھے ان میں سے کتنے باقی ہیں اور انھیں کس طرح نفع بخش طریقہ پر دوبارہ زندہ کیا جا سکتا ہے۔ ایسوسی ایشن قدرتی طور پہ اپنی خاص امداد ان صنعتوں کو دے گی جن کا رواج عام ہے جن کے لئے سرمایہ کی بہت کم ضرورت ہوتی ہے جن سے بہت سے لوگ متاثر ہوتے ہیں اور جن کا ہر گاؤں بغیر بیرونی امداد کے آسانی سے انتظام کر سکتا ہے۔ وہ صنعتیں جو ان شرائط کو پورا کرتی ہیں اور جنھیں اس وجہ سے فائدہ کے ساتھ دوبارہ زندہ یا جاری کیا جا سکتا ہے حسب ذیل ہیں:۔ سوت کی کتائی اور بنائی۔ چمڑے کی دباغت، تیل نکالنا، گڑ اور کاغذ بنانا۔ آخر الذکر کو چھوڑ کر ان میں سے ہر ایک کے لئے اشیاءِ خام تقریباً ہر جگہ پائی جاتی ہیں۔ ان کے لئے بہت کم سرمایہ کی ضرورت ہے۔ جس مہارت کی ضرورت ہے وہ آسانی سے حاصل کی جا سکتی ہے اور ان کی طلب بہت زیادہ ہے۔ چنانچہ انھیں ایسوسی ایشن کے پروگرام میں فی الفور داخل کر لیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر چمڑا رنگنے کو لیجئے۔ ہر گاؤں میں مردہ جانور ملتے ہیں اس وقت انھیں عموماً پھینک دیا جاتا ہے اور انھیں یا تو ہریجن کھانے کے لئے کاٹ لیتے ہیں یا انھیں کتوں، کووں اور گدھوں کے کھانے کے لئے ڈال دیا جاتا ہے۔ چمڑا اور ہڈیاں عموماً تمام

ضایع ہو جاتی ہیں اور جب لاش کو کھلی ہوا میں سڑنے دیا جاتا ہے تو اس سے قرب و جوار میں گندگی پھیلتی ہے۔ اس کی جگہ ایسوسی ایشن کی نگرانی میں لوگوں کو یہ سکھایا جا رہا ہے کہ لاش کے کیا مختلف استعمال ممکن ہیں۔ لاش کی کھال اُتاری جاتی ہے۔ کھال کو نمک لگایا جاتا ہے اور پھر اسے دباغت کی جگہ لے جایا جاتا ہے جہاں اسے صاف کرکے چمڑا بنایا جاتا ہے۔ کھال کے صاف کرنے میں جو گوشت نکلتا ہے اس سے سریش بنایا جاتا ہے۔ اوجھڑی سے چربی علیحدہ کی جاتی ہے اور آنتوں سے تانت نکالی جاتی ہے جو ٹینس کے بلے اور وائلن کی تانت بنانے میں استعمال کی جاتی ہے۔ گوشت اور ہڈیوں کو پانی میں سات آٹھ گھنٹے اُبالا جاتا ہے۔ چربی سطح پر آجاتی ہے۔ اس طرح جو چربی علیحدہ ہو جاتی ہے اسے پہیوں کو چکنا کرنے اور دوسرے صنعتی کاموں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ خوب اُبالی ہوئی ہڈیوں اور گوشت کو دھوپ میں خشک کر لیا جاتا ہے اور پھر اس کو پیس کر اس کا سفوف بنا لیا جاتا ہے۔ یہ سفوف بہت قیمتی کھاد ہے اور آسانی سے بازار میں فروخت کیا جا سکتا ہے۔ سینگوں کے کنگھے، چاقو کے دستے اور ایسی ہی اور چیزیں بنائی جاتی ہیں۔ اس کام کے لئے ہڈیوں کا بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ مردہ جانور کے تقریباً ہر حصہ سے جو مختلف کام لئے جا سکتے ہیں۔ اور ان سے جو مختلف صنعتیں پیدا ہوتی ہیں جب ان پر غور کیا جاتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ عدم واقفیت کی وجہ سے ہمارے ملک کی کس قدر کثیر دولت ضایع ہو رہی ہے۔ ایسوسی ایشن سے جو لوگ متعلق ہیں یہ ان کا کام ہوگا کہ وہ ان وسائل کی تحقیقات کریں اور جو چیزیں اب بظاہر بے کار نظر آتی ہیں ان سے گاؤں والوں کے لئے دولت اور روزگار پیدا کریں۔

عوام کے سخت افلاس کا ایک سبب یہ ہے کہ گذشتہ صدی میں ذہین اور پڑھے لکھے لوگ دیہات سے کھنچ کر شہروں میں آبسے ہیں اور انھوں نے ادبی تعلیم پا کر گورنمنٹ کے محکموں میں عہدے اور کلرکوں کی جگہیں حاصل کر لی ہیں اور گاؤں ان کے فیض سے محروم ہو گیا ہے۔ ان میں سے کچھ لوگ تاجر اور آڑتی بھی بن گئے ہیں نتیجہ اس کا یہ ہوا ہے کہ دیہات کی صنعتیں ان قابل افراد کی رہنمائی سے محروم ہو کر زوال کی طرف مائل ہو گئی ہیں۔ کسی صنعت کے کامیابی کے ساتھ چلانے کے لئے تین قسم کے آدمیوں کی ضرورت ہے تاجر، ماہر صنعت اور ادنیٰ مزدور۔ تاجر اور ماہر صنعت تو اس نئے دور میں ترک سکونت کر کے شہروں میں جا بسے ہیں لیکن ادنیٰ مزدور جو کوئی کام ذہانت سے نہیں کر سکتے صرف وہ گاؤں کی صنعتوں کا کام چلانے کے لئے باقی رہ گئے ہیں۔

اس لئے ہمیں گاؤں کے طریقہ پیداوار کی موجودہ خرابیوں پر افسوس نہ کرنا چاہیئے ۔ دیہاتی صنعتوں کی ایسوسی ایشن اس صورت حال کا علاج گاؤں کے کاروبار میں تجارتی طریقے اور فنی مہارت رائج کر کے کرنا چاہتی ہے اور اس طرح ان تین عناصر میں جو صنعتی ترقی کے لئے ضروری ہیں دوبارہ توازن قائم کرنا چاہتی ہے ۔ اوپر کی مثال کو اگر سامنے رکھا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ گاؤں میں جو اسراف پسند طریقے مردہ جانوروں کو ختم کرنے کے لئے رائج ہیں وہ سب اُس جہالت کا نتیجہ ہیں جن کی وجہ سے گاؤں والے لاش سے مختلف قسم کے فائدے اور وہ طریقے جن سے یہ فائدے حاصل ہو سکتے ہیں اختیار نہیں کر سکتے ۔ فنی علم کی ضرورت ہے جس کی گاؤں والوں میں کمی ہے ۔ صرف اس علم کے ذریعہ سے ہی گاؤں والے زیر بحث طریقوں کو اختیار کر سکتے ہیں ۔ جب فنی ماہر گاؤں والوں کو نئے طریقے بتلا دے گا اس وقت ماہر تجارت کی صنعت کو تنظیم دینے اور اس کو معقول کاروباری بنیاد پر قائم کرنے کے لئے ضرورت ہوگی ۔ دیہاتی صنعتوں کی ایسوسی ایشن کو توقع ہے کہ وہ اس قسم کے ماہروں کو شہر سے نکال کر دوبارہ دیہاتوں میں دیہاتی صنعتوں کو زندہ کرنے اور ترقی دینے کے لئے بھیج سکے گی ۔

دوسرا اہم کام جو ایسوسی ایشن نے اپنے ذمہ لیا ہے وہ پیداوار کے بہتر طریقوں کی علمی تحقیقات کا ہے تاکہ اس ذریعہ سے گاؤں والوں کی پیداوار کی مقدار اور نوعیت کو بڑھایا جا سکے ۔ اس مقصد کے لئے مختلف قسم کی (مثلاً تیل نکالنے والی، گھی دودھ کی، شہد پالنے والی، کاغذ بنانے والی چمڑے کو رنگنے والی، سوت کاتنے اور بننے والی) صنعتوں کے متعلق مرکزی دفتر میں تحقیقات کا سلسلہ جاری ہے اور رفتہ رفتہ اور دوسری صنعتیں بھی اس میں شامل کر لی جائیں گی ۔ تمام ملک کے دیہاتی کام سے باخبر رہنے کے علاوہ ایسوسی ایشن کو توقع ہے کہ وہ پیداوار دولت، حفظان صحت اور غذا کے متعلق ملک کے ایک حصہ میں جو بہتر طریقے رائج ہیں ان کی اشاعت دوسرے حصوں میں بھی کر سکے گی ۔

توقع یہ کی جاتی ہے کہ بہت جلد ایسوسی ایشن کے پاس دیہی صنعتوں کا ایک عجائب خانہ ہو جائے گا جہاں نہ صرف تمام ملک کی دیہی اشیار کی نمائش ہوا کرے گی بلکہ ان کے بنانے کے جو مختلف طریقے رائج ہیں ان کی بھی نمائش ہوگی تاکہ جو لوگ انھیں دیکھنے آئیں انھیں علمی فائدہ حاصل ہو اور وہ اس بات کو سمجھ سکیں کہ کس حد تک ملک کے ایک حصہ میں جو طریقے رائج ہیں وہ نفع کے ساتھ دوسرے حصے میں اختیار کئے جا سکتے ہیں اور نئے

طریقوں کی ضروری تعلیم حاصل کر سکیں۔ عجائب خانہ سے متعلق ایک کتب خانہ بھی ہوگا جہاں صنعت سے متعلق جس قدر لٹریچر موجود ہے وہ دستیاب ہو سکے گا۔ رفتہ رفتہ دیہی تعلیم کا ایک مرکز بھی ترقی پا جائے گا جہاں دیہات کے کام کرنے والوں کو جس تربیت کی انھیں ضرورت ہے دی جا سکے گی۔

۶۔ اپیل

یہ ظاہر ہے کہ ایسوسی ایشن کا کام اس وقت تک قابل اطمینان طریقہ پر نہیں چل سکتا جب تک وہ لوگ جن کے پاس دیہات کی تباہ حالت کو دیکھنے کے لئے آنکھیں، سننے کے لئے کان اور سمجھنے کے لئے دل ہیں اشتراک عمل کے لئے آمادہ نہ ہوں۔ احاطہ مدراس کے ایک سرکاری افسر کی پیمائش کے مطابق سنہ ۱۹۳۳ء سے سنہ ۱۹۳۴ء تک دیہی آبادی کا قرض فی کس ۳۸ روپیہ اور فی خاندان ۱۹۴ روپیہ رہا۔ اُن کی آمدنی اسی زمانہ میں پونے بارہ روپیہ سال رہی جس کی معنی یہ ہیں کہ ایک روپیہ ماہانہ کی آمدنی میں دیہاتیوں کا کھانا، کپڑا، مکان، قرض پر سود اور تمام دوسرے ضمنی اخراجات کو برداشت کرنا پڑا۔ یہ ابھی تک ایک معمہ ہے کہ ان حالات میں کسان زندگی کس طریقہ پر گذارتا ہے۔ اس کی زندگی صرف اس قدر کہی جا سکتی ہے کہ وہ روح اور جسم کے تعلق کو قائم رکھتا ہے زندگی کے اُن آراموں میں سے اُسے کوئی آرام بھی حاصل نہیں ہے جو زندگی کو خوشگوار بناتے ہیں۔ اگر تعلیم یافتہ اور دولت مند لوگوں کو گاؤں والوں کی جو ہماری آبادی کا بیشتر حصہ ہیں اور جن کی حالت روز بد سے بدتر ہوتی جا رہی ہے بدنصیب زندگی کا تھوڑا سا بھی علم ہوتا تو وہ اس وقت تک چین سے نہ بیٹھ سکتے جب تک کہ وہ گاؤں والوں کی حالت درست کرنے میں کچھ نہ کچھ حصہ نہ لیتے۔ ہمیں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ ہمارا ملک بہر حال ایک دیہی ملک ہے اس لئے جب تک ہم دیہات کی اصلاح کا کام نہ کریں گے اس وقت تک ہم اپنے ملک کی عملاً کوئی خدمت نہیں کر سکتے اس لئے تمام ان لوگوں کے لئے جو ملک کی اصلاح کا کام کرنا چاہتے ہیں یہیں سب سے زیادہ موقع ہے۔

اس کام میں صرف مرد ہی نہیں بلکہ عورتیں بھی حصہ لے سکتی ہیں حقیقت تو یہ ہے کہ عورتیں دیہات کا کام مردوں سے بھی زیادہ کر سکتی ہیں کیونکہ گاؤں کے کام کا تعلق افلاس، مصیبت، حفظان صحت غذا اور تمام ایسے کاموں سے ہے جن سے عورت کو بنیادی طور پر زیادہ دلچسپی ہے۔ عورتیں ہی بہر حال گھر

گرہست ہوتی ہیں اور اس حیثیت سے ہندوستان کے مستقبل کی کنجی ان ہی کے ہاتھ میں ہے۔ مائیں بچوں کی جو تربیت کرتی ہیں ملک کا مستقبل اسی سے وابستہ ہے۔ اگر ان میں سودیشی کی روح پیدا کرادی جائے اور اگر وہ اپنے بچوں کو اپنے پڑوسیوں کے حقوق سے واقف کرادیں تو دیہی صنعتوں کی انجمن کا کام تکمیل کو پہنچ جائے گا۔ میدان بہت وسیع ہے اور اس میں عورت مرد، ہندو اور مسلمان، کانگریسی اور غیر کانگریسی ہر ایک کی جہد و سعی کی گنجائش ہے۔ لہذا ایسوسی ایشن سب کو بلا امتیاز و تفریق آگے بڑھنے اور مدد کرنے کی دعوت دیتی ہے۔

مالیات عامہ اور ہمارے افلاس کے اسباب

"وہ جو دھوپ اور گرمیوں کی مصیبت اٹھاتے ہیں۔ جن کا اسراف یہ ہے کہ دنیا کی مسرف ترین حکومت کا بار اٹھاتے ہوئے ہیں۔ جن کی سخاوت اس میں مضمر ہے کہ وہ اپنے بیوی بچوں کا پیٹ کاٹ کر مالیہ ادا کرتے ہیں۔ اور جن کے کمزور کاندھوں پر برطانیہ کی عظمت کا بوجھ ہے"

ان کے نام یہ کتاب معنون کی جاتی ہے۔

"بیلوں کے تھوتھنے نہ باندھو۔ جب وہ تمہاری داہی کر رہے ہوں"

مندرجہ بالا الفاظ میں جے، سی، کمارپا صاحب ایم اے، بی، ایس، سی نے اپنی کتاب ہندوستان کے شکستہ حال غریبوں کے نام معنون کی ہے۔ ایسے ہمدرد اور محب قوم نے جو تبصرہ ہندوستان کی موجودہ اقتصادی حالت پر کیا ہے اس سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ ہماری غربت پر مالیات عامہ نے کیا کیا اثر ڈالے ہیں۔

یہ کتاب ہر ہندوستانی کی نظر سے گذرنی چاہیے صفحات ۲۲۵ - قیمت صرف بارہ آنے (۱۲/)

مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

کسان

اس کے افلاس کے اسباب اور ان کا علاج

از

جناب چودھری مختار سنگھ صاحب

قدیم زمانے میں کسان کا کیا درجہ تھا۔ اور دیہی نظام کی کیا صورت تھی؟ پھر کس طرح رفتہ رفتہ اس کو خوش حال سے محتاج کیا گیا؟ کس طرح ہندوستان کی صنعتوں کو تباہ کیا گیا؟ اور کس طرح ایک صنعتی ملک کو زرعی ملک بنا دیا گیا؟ اب کسان کی حالت ناگفتہ بہ کیوں ہے اور کس طرح پھر وہ خوش حال ہو سکتا ہے۔

ان سب چیزوں کا اگر آپ جواب چاہتے ہیں تو یہ کتاب ملاحظہ کیجیے۔

کتاب مجلد ہے۔ تعداد صفحات ۳۷۵

قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے

مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

(جامعہ پریس دہلی)